title - Pas-E-Parda

creator - Agha Haider Dehelvi;Murattiba Abdul Basit

Publisher - Matba Muslim University (Aligarh)

Date - 1345

Pages - 183

Subjects - Urdu Adab - Muzameen; Urdu Adab - Inshaiye.

مجموعہ مضامین جناب آغا حیدر صاحب دہلوی

مرتبۂ

مولوی عبدالباسط صاحب ایم اے (علیگ)

باہتمام محمد احید الدین ایف آر اے ایس (لندن)

مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں چھپا ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء

۱۰۰۰ جلد

قیمت فی جلد عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچھڑوں کی جگ بیتی

دیکھنا کھو گی تو سہی کہ خط بھیجے آج دن دس ایک ہونے کو آئے لیکن جواب ندارد۔ کچھ تو پہلے میرا جی ہی اچھا نہ تھا۔ سر میں درد رہتا تھا۔ مارے درد کے کنپٹیاں پڑی لپ لپ کرتی تھیں بھیجے کا یہ حال تھا کہ ذرا سی حرکت سے گندے انڈے کی طرح بھل بھل کرتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے آنکھوں تلے وہ اندھیرا آتا تھا کہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔ غرض اب سے دو ایسی ماندی پڑی تھی کہ دھر ہی کی سیدھی تھی جو بچ گئی دشمنوں کے وہ لینے کے دینے پڑے تھے کہ توبہ ہی بھلی۔ اللہ کے گھر سے پھری ہوں

دیا لیا ہی سامنے آگیا، چلو، خیر اب بیماری کا رونا کیا روؤں۔ پھر اسی اثنا میں دانش گاہ کے پرانے لڑکوں کا جلسہ شروع ہو گیا۔ خواجہ معین الدین کی چودھویں کو رات کا کھانا اسٹریچی دیوان میں تھا۔ فتح دروازے سے گھس کر اور اس کے مغلئی پیش طاق اور کچھ گھڑ نغلی محرابوں سے گزر کے جب سید محلّے میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے جنگی جو عمارت سامنے پڑتی ہے وہی اسٹریچی دیوان ہے، کوسے کی بچھوسے پتھر کی کٹی سڑک اس تک گئی ہے۔ اس عمارت کا ڈول مشرقی اور مغربی طرز کا مجموعی نمونہ ہے۔ لیکن ڈھچر سارا مغربی ہی ہے۔ البتہ سجاوٹ میں ایشیائی مذاق کو دخل دیا گیا ہے۔ دیوان کی چھت منڈھیا نما سلامی دار ہے۔ جس کا ڈھال پورب او پچھم جانب ہے۔ گلی کھپرے ماہی پشت کے اوپر لگے ہیں۔ اس کی منڈیر کوئی ہاتھ بھر اونچی ہوگی کنگورے دار ڈھلوان ہے۔ جو دو طرفہ آگے کے رخ چھت کی سلامی کے ساتھ ڈھلتی چلی آئی ہے۔ اور ان دو چوکور ستونوں پر جو اس کی سلامی کو روکتے ہیں، آن کر ختم ہو گئی ہے۔ چھت کی دو طرفہ سلامی کی وجہ سے دکھنی پیش دیوار اُلٹے سنگھاڑے نما ہو گئی ہے اس سنگھاڑے کی دمچی جو اوپر کی طرف ہے اور چھت کی مانگ ہے جہاں سے دو طرفہ چھت ڈھلوان ہوتی چلی گئی ہے۔ اس پر ایک شاہ جہانی چوکھنڈی برجی نوبت خانے[۱] نما

---

[۱] نوبت خانہ ٹھاٹر کی ایک چوکور عمارت بناتے ہیں۔ جس میں ہر چہار جانب دروازے محراب دار رکھے جاتے ہیں اوپر ایک گنبد بنا ہوتا ہے اور چاروں طرف ایک خوبصورت سا چھجہ۔ اس نوبت خانہ کا سارا ڈھچر تو ٹھاٹر بندی کا ہوتا ہے۔ لیکن ابرک پنی اور رنگین پھول دار کاغذوں سے خوب خوب سجایا جاتا ہے۔ مینہ کے قریب کہار اسکو کندھوں پر لیکر برات کے آگے آگے چلتے ہیں اور نوبت والے

بنی ہوئی ہے۔ تکھونٹی پیش دیواریں سے چار بنگلے نما سنگین براٰمدے آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔ تین تو ایک ہی لنکتار میں چلے گئے ہیں اور چوتھا مانگ کی بُرجی سی کوئی ڈیڑھ گز نیچے۔ نیچے والی قطار میں جو بیچ کا ہے عین اُس کے اوپر کچھ فاصلے سے واقع ہے۔ سب کے تین تین در سامنے ہیں۔ اور ایک ایک در پہلوؤں میں ہے۔ دروں کی محرابیں شاہجہانی طرز کی بنگڑیدار ہیں۔ جن کے ستون نازک پتلے پتلے سیدھی ڈوری کی کھدائی کے برتن دار ہیں۔ دیوان کی کرسی خاصی اونچی ہے۔ آگے کو لمبا خوب چوڑا اچکلا برامدہ ہے۔ برامدے کی چھت لداؤ کی ڈاٹ دار ہے۔ اور دیوان کی پیش دیوار کے آگے جو ہے تو خاصی بیٹھک گاہ سی بن گئی ہے۔ اسکی پشت پر تو وہی سنگھاڑے نما دیوار ہے۔ اور باقی تین طرف فصیل نما کنگورے دار منڈیر ہے۔ منڈیر کی لمبان جو پورب پچھم جانب ہے۔ اس کی بالکل بیچ میں ایک سُرخ پتھر جڑا ہے۔ جس کے اوپر کے رُخ بالکل بیچ میں ایک کنول کی کلی پتھر کی ترشی دَہری ہے۔ یہاں سے دونوں طرف ڈھلواں منڈیر شروع ہوتی ہے اور دونوں جانب کج بینی کا مروڑا بناتی ہوئی بیٹھکگاہ کی کنگورے دار منڈیر سے ملجاتی ہے۔ اس پتھر کے بیچوں بیچ سامنے کے رُخ۔ سنگ مرمر کا ایک گرد ا ہے جس پر اسگاہ کا نشان اور دیوان کا نام عربی حروف میں اُبھرواں کھدا ہے۔ اس کے نیچے زرد سے پرت دار پتھر کا چھجّہ ہے جو برامدے کے سب طرف منڈیر کے نیچے نیچے چلا گیا ہے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲) اس میں بیٹھے بجاتے رہتے ہیں۔

اِس چھجّے پر گمّہ اینٹوں کا گردنہ ہے۔ گردنے کے نیچے برامدے کے جو بیچ کا بڑا در ہے اُس کے اوپر انگریزی سُنہری حروف کسی دھات کے بنے جڑے ہیں۔ شاید دیوان کا ہی نام ہے۔ جو انگریزی حرفوں میں ہے ہاں برامدے کی جو کنگورے دار منڈیر ہے۔ یہ تو بھول ہی گئی۔ اس کے آگے دونوں کونوں پر دو بُرجیاں سنگین بنی ہیں! ور ایک بُرجی پہلے بتا آئی ہوں۔ جو دیوار کی منڈھیّا نما چھت پر آگے ہی دار کو دھنّی کی جگہ بنی ہے اور کچھ عجیب ہی ادلوا ولوا ادھی ادبی سی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ چھت جو دو طرفہ سلامی دار ہے اور معمولی چھتوں کی طرح چورس چوکور نہیں مغربی طرز کی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ ایسی ہی چھت کا نمونہ، فتحپور سیکری میں ہے شاید بیربل کا جو محل ہے۔ اِس کی چھت ایسی ہی ہے۔ مگر کیا تعجب ہے کہ یہ طرز فرنگیوں سے ہی اُڑایا گیا ہو۔ کیونکہ اکبر بادشاہ کی ایک بیگم تو کرسٹانی تھی اور ایک شاید ترکن۔ اور اُن کی ہی موجودگی نے کچھ طرزِ عمارت پر اثر کیا ہو۔ ہندوستان میں تو البتہ منڈھیّا کی چھتیں ایسی ہوتی ہیں جو پھونس کی چھائی جاتی ہیں۔ خیر جو کچھ بھی ہو۔ دو بُرجیاں تو اِدھر اُدھر کی برامدے کی منڈیر والی اور ایک یہ بُرجی بالکل ایسی معلوم ہوتی۔ کہ جیسے کسی انگریزن کو پھول چوک اور سیس پھول پہنا دیں اور وہ اِسے اوپری اوپری معلوم ہوں۔ غرض چھت کی بُرجی تو کچھ عجیب ہی بے کینڈے بنی ہے۔ لیکن اگر ٹھنڈی کردیں تو بیش دیوار اور چھت لنڈ منڈ نکٹی بوچی سی معلوم ہو۔ چلو خیر جیسی بھی ہے اب تو اچھی ہی ہے۔

لو بھئیں کوٹھے کوٹھے ماڑی ماڑی تو خوب بھید کا چکی اب نیچے برامدے میں آؤ۔ پیشترہ
میں سات کھلے در ہیں۔ اور دو در ایک اِدھر اور ایک اُدھر تیغے دار ہیں ان کی
محرابیں گول سی پان نما ہیں۔ پان بھی جیسے مہوبے کا۔ اِس طرح پیشترہ میں برامدے
کے نو محرابیں ہوئیں۔ بیچ کا در اور محراب دونوں بڑے ہیں اور اِدھر اُدھر کی
چار محرابیں ذرا چھوٹی ہیں۔ جو دو در تیغہ لگے ہیں اُن میں سے دو جھروکے نما
کھڑکیاں سی ذرا آگے کو نکلی ہوئی ہیں۔ اِن میں پتھر کی جالی لگی ہی۔ جالی کا جال
بدروم کا ہی دونوں طرف پورب پچھم جانب برآمدے کے تین تین در ہیں۔ جن کی
محرابیں ذرا لمبوتری پان نما ہیں۔ جو لکھنؤ کے بنگلی پانوں سے کچھ ملتی جلتی ہیں۔
اِس طرح دیکھو تو نو محرابیں تو برامدے کی لمبان میں ہوئیں اور تین تین دونوں طرف
چکلان میں۔ برآمدے کی چوڑان میں دو گول کماچنے نما محرابیں اس کو تین حصوں
میں تقسیم کرتی ہیں ایک تو بیچ کا بڑا حصّہ جس میں کھلے در سات برامدے کے اور
تین دیوان میں داخلے کے دروازے اور دو اِدھر اُدھر برابر کے چھوٹے حصے
ان کے ایک سمت تو برامدے کے بغلی تین تین در ہوئے اور دوسری سمت کماچنے نما
گول محراب ہوئی دکھّن جانب کھڑکی والی بیتغے دار محراب اور اُتّر میں ایک
چھوٹا سا دیوان کے داخلے کا دروازہ۔ برامدے کے بیچ کے حصہ میں دو کتبے
لگے ہیں۔ ایک دیوان کی دیوار میں لگا ہی اور دوسرا بیچ والے در کے سنگین ستون
میں کھدا ہی۔ برامدے کے ستون چپٹے چوکھونٹے ہیں اُن کے نیچے کرسی کے قریب

سیڑھیوں کے اِدھر اُدھر کیاریاں ہیں جن میں سُکھ درسن، گُلِ رعنا، شاہ گُل اور سُرخ گلاب کے پیڑ لگے ہیں۔ باہر تو دیوان کے ہزاروں چیزیں ہیں کہاں تک کوئی لکھے اس کو تو دفتر چاہئیں۔ اس کے داخلے کے جو تین دروازے ہیں اُن میں بیچ کا دروازہ بڑا ہے اور ادھر اُدھر کے دونوں چھوٹے ہیں۔ بڑا شاندار۔ کوئی ہزار آدمی سما سکیں بجلی کی روشنی سے سارا دیوان نور کا بقعہ بنا ہوا تھا۔ فر فر برقی پنکھے چل رہے تھے۔ اُس کی چھت خاتم بندی کی نہیں۔ اتنی ہی سی کسر رہ گئی تھی ورنہ اُڑنے لگتا۔ پہلے تو جانے دو لٹھے یا دوسوتی کی چھت گیری جا بجا سے ہونٹ نکلے ہوئے تھے۔ لیکن اب تختوں کی بن گئی ہے۔ مگر تختے خوبصورتی سے نہیں لگے اکثر جگہ اُنگل اُنگل بھر کا فاصلہ ہے اور روغن جو اُن پہ سفید ہوا ہے۔ تو وہ کالی کالی دراڑیں چشمِ بدبیں کو بُری معلوم ہوتی ہیں۔ حاشیہ کا روغن سبز رنگ کا ہے اور قلابوں کے گردے بھی سبز ہی ہیں۔ آدھے دیوان کی دونوں کروٹوں میں آمنے سامنے پتلے پتلے سات سات در کے دالان ہیں۔ ان کی محرابیں گول ہیں۔ محرابوں کی رو کار پہ سیدھے قلمی تنگاف ہیں جس سے اُن کی وضع کچھ الحمرا

۱؎ زرد رنگ کا گلاب جسکی پنکھڑیوں میں پتلی پتلی نازک نازک گلابی رنگ کی نسیں ہوتی ہیں جو بڑی پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے کسی حسین پر بین کا رنگ نقاہت سے زرد سا ہو۔ اور جلد کی نزاکت اور لطافت کی وجہ سے عارض کی مہین باریک گلابی نسیں نمایاں ہوں۔ خوشبو بھی اس کی بڑی بھینی بھینی ہوتی ہے مالی اس کا انگریزی نام مارشل نیلیا بتاتے ہیں۔

۲؎ ایک قسم کا موٹا سوتی دیسی کپڑا۔

کی سی ہو گئی ہے۔ اگرچہ ساخت بالکل وہی نہیں ہے۔ لیکن جھلک الحمرا کی سی ضرور مار جاتی ہے۔ کھبے چپٹے۔ جو کھونٹے اور پیل پائے کچھ مخروطی ہیں۔ محرابوں کے کلید سنگ[1] ساڈے ہیں (Key-stone) ان دونوں بغلی دالانوں کے اوپر بالاخانے ہیں یہ بھی دالان نما ہیں۔ اور سات سات در کے ہیں۔ در شاہجہانی اور عربی ساخت کے ہیں مگر محرابیں اچھوتی شاہجہانی طرز کی نبگرٹیدار ہیں جو دو دو نازک چوکور ستونوں پر سہارا لیئے ہیں اور ان ستونوں کی وجہ سے ان دروں کی بناوٹ عربی اور شاہجہانی طرز کی ہو گئی ہے ان دروں کے آگے تختوں کا چھجہ ہے جس پہ لوہے کا کٹہرا بڑا خوبصورت لگا ہے۔ اور اس طرح سے چھوٹا سا خاصہ خوبصورت برامدہ بن گیا ہے۔ دیوان کی دونوں بغلوں سے جو محمود محلے کو دو راستے گئے ہیں۔ ان ہی باہر کے راستوں سے ان دونوں برامدوں کو زینے جاتے ہیں۔ ان دروں کے ستونوں پر لالی کی لپائی ہے۔ باہر کی روکار پر بھی اسی کی لپائی ہے۔ رنگ تو کچھ اینٹ کھویا اینٹ کھویا سا ہے مگر معلوم اچھا ہوتا ہے۔ دیوان کے دروازوں اور کھڑکیوں پر شیشم یا سال کے بڑے خوبصورت بستے چڑھے ہوئے ہیں۔ جن میں شیشے بڑی خوبصورتی اور صنعت سے لگائے گئے ہیں۔ جو اقلیدس کی مختلف شکلیں[2] پیش کرتے ہیں۔ دیوان کے دروازے اور کھڑکیوں کی محرابیں ذرا کچی لیئے گوتھی

---

[1] اس لفظ کی صحیح اصطلاح کسی دلّی کے پرانے معمار سے دریافت کی جائے

[2] گاتھک

طرز کی ہیں۔ وہی نگوڑی سیدھی سلامی دار محرابیں جیسی گرجوں کی ہوتی ہیں۔ اور یہاں کی جو محرابیں ذرا کھیدار ہیں۔ تو بالکل اٹّی کٹی منڈی[1] کی سلیم شاہی جوتیاں۔ پنجہ اوپر کیئے۔ دہری معلوم ہوتی ہیں۔ دیوان کا فرش لے سے کچھ اس وقت دھیان نہیں۔ شاید پتھر کی سلوں کا ہے۔ لیکن برامدے میں تو سنگین ہی شکر پارے کا فرش ہے۔ بے ترتیبی سے لگا ہے۔ صدر دروازہ میں گھستے ہی جو دیوان کا ضلع سامنے ہے وہ کئی پہلو کا ہے۔ جس کی وضع کچھ کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے مہال کا خانہ لے کر خوبصورتی سے آدھا کاٹ دیں اس حصے کے بیچ کا جو بڑا پہلو ہے اس کی جڑ میں نیچے کی طرف فرش سے کچھ ملا ہوا بنیادی پتھر[2] لاٹھ لٹن کے

---

[1] منڈی۔ دلی کے باہر پھوٹلے دروازے سے کوئی پون کوس ہے۔ پھل پھلاری باہر کا اور باغوں کا جو لوٹ کے آتا ہے۔ تو یہیں اس کی منڈی لگتی ہے۔ لگے بندھے بیکار کنجڑے کاچھی خرید کر لے جاتے ہیں اور شہر میں بیچتے ہیں۔ یہی روشن آرا بیگم کا باغ اور محلدار خاں ہے جہاں تیر کا میلہ لگتا ہے منڈی میں جو جوتیاں بنتی ہیں وہ بہت مضبوط ہوتی ہیں لیکن پنجہ ذرا چوڑا ہوتا ہے۔ شراز (معلوم نہیں سراج کا بگڑا ہوا ہے یا شیراز کا) کے ہاں کی جوتیوں کی طرح پنجے کا گھاٹ سُبک اور پتلا نہیں ہوتا یہیں سن ستاون میں انگریزوں کی فوج اور پچھیرا پلٹن کی لڑائی ہوئی ہے۔ فتحگڑھ کے قریب ہی ہے۔ پانی پت کرنال کو جو سڑک گئی ہے۔ یہیں سے گئی ہے اور یہیں سے دو طرفہ باغوں کا سلسلہ کوسوں چلا گیا ہے۔ ادھر کی ہی طرف شاہ باغ ہے جہاں اورنگ زیب نے تاج شاہی سر پر رکھا تھا ایک اور باغ ہے جو لال باغ کہلاتا ہے۔ اس میں آغا حسن جان نے جشن منایا تھا اور درختوں کی ڈالی ڈالی اور ٹہنی ٹہنی پر لال قندیلیں چڑھا یا گیا تھا۔ روشنی کا تمام سامان جھاڑ فانوس دیوار گیریاں۔ لگن، سہ شاخے، گلاس ٹین، مردنگ سب کے سب سرخ شیشے کے تھے اسلیئے اس کا نام لال باغ پڑ گیا رہیاں کا سفیدہ اور حکیمی آڑو مشہور ہے) [2] لاٹھ لارڈ کا بگڑا ہوا ہے نہیں ہی لاٹھ کو چونکہ لاٹھ

ہاتھ کا دھرا ہوا لگا ہے جس پر کھجور، تاج اور پہلی کے چاند کا دانشگاہ کا نشان ہے۔ کچھ انگریزی اور عربی میں عبارت بھی کھدی ہے ان پہلوؤں میں کوئی فرش سے دو دو ہاتھ اونچی بڑی بڑی شاندار کھڑکیاں ہیں۔ اے کھڑکیاں کاہے کو خاصے دروازے ہیں جو پشت کی طرف کھلتے ہیں۔ اور بیچارے محمود محلے (کھلے کے وزن پر) کی بڑی بڑی کالی کالی کاہی کھائی کھپریلوں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اِن ہی کھڑکیوں کے اوپر اندر کے رُخ بیس بیس کتبوں کی پانچ قطاریں لگی ہیں اور ان بیویوں اور مردوں کے نام کھدے ہوئے ہیں جنھوں نے دانشگاہ کی مدد میں حصّہ لیا ہے۔ اندر کچھ اور کالے تختے اور پتھر کے کتبے وغیرہ لگے ہیں جن پر اوّل درجے کے کامیاب لڑکوں کے نام اور کتبوں پر معلوم نہیں کیا کیا اٹرم سٹرم لکھا ہوا ہے دو تصویریں بڑی بڑی اور ایک چھوٹی لگی ہوئی ہے ان سب پر لال قند کا غلاف چڑھا رہتا ہے۔ لمبی ایک تو دانشگاہ کے بانی اور اس کار روائی کے مُٹھ سر سید احمد خاں (پھولوں سے گوریری پر۔ آہی حور بخدمت

(بقیہ نوٹ ص ۸) سے مناسبت ہے۔ اس لیئے لاٹھ کہلاتا ہے۔ لاٹھ بلند ہے ہمارے لاٹھ صاحب بھی بلند پایہ ہیں۔ اٹل ہوتی ہے اور انکا راج بھی اٹل خیال کیا جاتا ہے مضبوط ہوتی ہے یہ بھی ارادہ میں مضبوط اور صائب الرائے ہوتے ہیں وہ پختہ ہوتی ہے اور یہ بھی پختہ کار اور بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں اسی لیئے لاٹھ صاحب کو لاٹھ صاحب کہنے لگے ہونگے [۱] سر سید احمد خاں صاحب کو سر اس لیئے کہتے ہیں کہ جب انکی عقل اور دانشمندی کا دور دور شہرہ ہوا تو ولایت کے لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ آخر اُن کے دماغ میں کیا چیز غیر معمولی ہے جو اس بلا کا ہے۔ اُنھوں نے انکا سر ایک خاص مدت کی

کو اور غلمان عظمت کو (خدمت کرنے اور عظمت دینے کو) ان کی تصویر ہے۔ دوسری تصویر جو بڑی ہے وہ اس صوبے کے چھوٹے لاٹھ صاحب کی ہے اور تیسری چھوٹی تصویر ہمارے شہنشاہ معظم جارج پنجم کے زمانہ ولی عہدی کی ہے۔ دیوان کا نقشہ تو خاصہ بندھ گیا ہوگا۔ اب کھانے کا سارا حال لکھ سُناتی ہوں۔ سارے دیوان میں خوب چوڑی چکلی میزیں بڑی خوبصورتی اور خوش سلیقگی سے بچھی ہوئی تھیں۔ اُجلے اُجلے صاف ستھرے برّاق سے میز پوش پڑے تھے۔ جن کے چاروں طرف قاعدے سے کرسیاں اور تختوں کی نشست گاہیں (بنچیں) رکھی ہوئی تھیں میزوں پہ قرینے اور سلیقے سے کھانے چُنے تھے۔ کھانے میں کیا کیا تھا۔ یہ بھی بتاتی ہوں۔ ایک ایک جوڑ (تھئی۔ دو سے مراد نہیں ہے۔ بلکہ کئی کئی روٹیاں جو اوپر تلے رکھ دی جاتی ہیں۔ انھیں تھئی بھی کہتے ہیں اور جوڑ بھی۔ جوڑ عموماً پاؤ بھر کی روٹیوں کا ہوتا ہے۔ اور تھئی میں تول کا ٹھیکہ نہیں۔ مثلاً اے ہے تو نے تو غضب کیا کہ تھئی کی تھئی روٹیوں کی حوالے کی کھائیگی تو وہ کیا خاک۔ پوٹلا باندھ کر گھر لیجائیگی)

(بقیہ نوٹ ص ۹) اجارے پر خرید لیا۔ اگر اس عرصے میں یہ مرجائیں تو وہ کاٹ لیں اور عمل جرّاحی کر کے چیر پھاڑ کر دیکھیں کہ کیا اندر اسرار ہے۔ مگر مدت نکل گئی اور سر بچ گیا۔ اُن کو تو روپیہ کی ضرورت رہتی تھی کہ جتنا آتا تھا وہ اس دانشگاہ میں جھونکا جاتا تھا۔ اور دوزخ کا پیٹ کسطرح بھرنے پر آتا تھا نہ آتا ہے اسلیئے سر تین دفعہ بکا۔ ایکدفعہ کلکتہ میں کمپنی صاحب کی حکومت کے بعد دوسری دفعہ ولایت میں اور جانے تیسری کونسی جگہ ہے جہاں بکا تھا۔ مگر یہ ایسے قسمت کے دھنی اور نصیبے کے سکندر تھے ہمیشہ بچ بچ گیا اور میعاد نکل نکل گئی اسلیئے انھیں سر سید کہنے لگے

منجھولی خمیری روٹیوں کا اور ایک دیدناسی عیوضی روٹی (ایک قسم کی روٹی جس کا مزہ باقرخانی اور شیرمال سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ بلکہ مال جوڑ ڈالا جاتا ہے وہ باقرخانی سے کم اور شیرمال سے زیادہ ہوتا ہے۔) رنگ روپ کی اچھی ایک چینی کے سفید چھوٹے سے پیالے میں سادہ سالن۔ یہ بھی اچھا تاردار (تار۔ سالن کے اوپر جو گھی تیرتا ہوتا ہے) ایک رکابی بریانی کی یہ بھی بو باس آب نمک سے درست (آب نمک صورت اور ذائقہ) چاول بڑے بڑے جیسے چڑیا کی جیب خوب کھلے کھلے اور اچھی طرح گلے ہوئے ایک چوڑے موہنہ کی پیالی میں بورانی۔ یہ بھی اچھی چٹپٹی کھائیے سے زبان کھلے۔ گھنٹوں بیٹھے چٹخارے بھرے۔ شاید شامی کباب بھی تھے۔ جن میں پنیر اور ادرک کی بھرائی تو خاک نہ تھی۔ ہاں پودینے اور ہری مرچوں کی بھرمار ضرور تھی۔ اور شاید خشخش اور چنے بھی نہ ملے تھے۔ جو خستگی اور سوندھا پن آتا ہے۔ یا ہونگے بھی تو یونہیں نام چار کو۔ ایک طشتری میں انفس پارے (باہر والوں کے نان پاؤ کے ٹکڑے۔ نگوڑے بھیک کے نہیں) مزے میں تو اچھے تھے۔ اور پکّے بھی گداز گداز تھے۔ مگر کچھ ٹوٹ کر گھل مل سے گئے تھے۔ شاید یہ آٹا رنلے کی خرابی ہوگی کہ لبڑ دھوں دھوں میں نکالے۔ اور مارے دبا کے کفگیر کے ہاتھ کہ چورا ملیدہ ہو کے رہ گئے۔ کھویا دل کھول کے ڈالا تھا۔ مگر کیوڑہ ندارد تھا۔ جس کے سبب خمیر کی کھٹّی کھٹّی مچھ مچھاند[ا] کیوڑہ زعفران ڈالے بھی گئے ہونگے۔ تو بس یونہیں شگون

[ا] خاص قسم کی بو جیسی کھٹی دودھ وغیرہ چیزوں میں سے آتی ہے۔ گوشت کی بو بساند۔ مچھلی کی مچھ مچھاند۔ سڑی ہوئی چیز کی بو سڑاند کہلاتی ہے۔

پورا کرنے کو۔ لیکن رنگ اچھا آیا تھا۔ جیسے گوری کے ہاتھوں کی مہندی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مٹی کی صراحیاں نگوڑی یہیں علی گڑھ کے بنے ڈھو بڑے بھر کے مُرادآبادی بھاری بھاری آبخورے۔ پیتے میں ایک قسم کی کسیاؤ کی بو آئے۔ مجھے اُن سے ہمیشہ کی نفرت رہی ہے۔ دھرے تھے۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے جو دیوان کے دروازے بند تھے تو ساری کھانے کی بُو دیوان میں گھٹ بس کر رہ گئی۔ جونہی دیوان کا دروازہ کھلا، گرتے پڑتے۔ لانگتے، پھلانگتے اندر گھسے۔ میں بھی تمہارے دولہ بھائی کے ساتھ مہمانوں میں داخل ہوئی۔ کھانے کا بھپکا وہ دماغ میں چڑھا کہ کھانے سے ارواح بھر گئی۔ بغیر کھائے، دیکھے ہی سے نیت بھر گئی۔ اچھی تم کہو گی تو سہی کہ شکل نگوڑی چڑیلوں کی سی اور دماغ پریوں سے بڑھ کر لے رہے ہیں خود اس عیب کو محسوس کر کے جھیپ جاتی ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ کوئی میرے بس کی بات ہے۔ دلّی پیاری میں میری اُٹھان ہی کچھ اس ڈھب سے ہوئی ہے کہ کبھی باہر کسی جوگی ہی نہیں رہی۔ اس وقت مجھے دادی حضرت کی کہیں یاد آگئی۔ اللہ اُن کو کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے۔ میری جان سے دور، سات قرآن درمیان جب کبھی میری ان نازک دماغیوں سے ناراض ہوتی تھیں تو کہا کرتی تھیں کہ تاناشاہ[1] کی نواسی نصیب کی کچھ خبر ہے کسی بُرے کے پلّے پڑی اور رگڑنے پڑے

---

[1] تاناشاہ کی نواسی۔ اگر دادی یہ طعنہ دیتی تو تاناشاہ کی نواسی کہتی اگر نانی یہ بول مارتی تو تاناشاہ کی پوتی کہتی۔ تاکہ اپنے پہ گالی نہ پڑے۔ گول کنڈہ کے بادشاہ اپنی نازک دماغی کی

مصالح، یا کسی باہر والے کے سر بندھی جہاں گوبروں کے چوتھ اور کوڑیوں کے ڈھیر ہو نگے۔ تو گھر کیسے کریگی۔ باہر والی ساس نندیں مارطعنے تشنوں کے جینے بھی نہ دیگی دعا مانگتی تھی کہ الٰہی کسی طرح کھانا جلدی بڑھے جو یہ ملغوبہ سامنے سے اُٹھے تمہارے بھائی نے بہتیری قدری کی بہتیرا چپکے چپکے کہا کہ بیگم دو ایک لقمے تو کھالو۔ لیکن کہاں کا کھانا۔ کھانے کے خیال سے ابکائیاں آتی تھیں۔ یوں ہی نوالے بناتی اور ٹونگا کرتی رہی۔ خالی بیٹھی مُنھ چلایا کی۔ کیونکہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا کھانے کی تہذیب کے خلاف ہے۔ خدا خدا کرکے کھانا ختم ہوا۔

بیگم بنڈو

اب جلسہ کی جان روحِ رواں سروجنی کی بابت سنو۔ ٹھمکا ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل، کھلتی ہوئی چمپئی رنگت، کتابی چہرہ، کھڑا کھڑا نقشہ، چہرہ سے متانت اور سنجیدگی ہویدا ہے مگر ساتھ ہی اس کے خوش خلق اور ہنس مکھ بھی ضرور ہیں۔ خوب خوب گھری گھری کالی کالی جٹی بھویں، جبیں کے اوپر چھوٹا سا، خوب گہرا سُرخ کسوم کا ٹیکہ

(بقیہ نوٹ ص ۱۲) وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اسکی موت کی بابت مشہور ہے کہ ایک گھوسن میلے کچیلے کپڑے پہنے پاس سے گزر گئی اور اس نازک دماغ کی روح پرواز کر گئی۔ اسی قسم کے اور طعنے ہیں۔ مثلاً "نادر شاہ کی رشتہ دار" غصّے ظلم و ستم کے لیے "محمد شاہ کی پوتی نواسی یا بیٹا بیٹی وغیرہ" ایسے فکرے لاؤ بالی آدمی کے لیئے واجد علی شاہ عیش و عشرت کے لیئے کہا جاتا ہے۔ ؎ باہر والا جو دلی کی فصیل کے باہر پیدا ہوا ہو۔ عربوں کا عجمی، آریوں کا ملیچھ، انگریزی کا نیٹو، یونانیوں کا باربیرین اور دلّی والوں باہر والا ایک ہی ہی اہمیت رکھتے ہیں۔

بڑی بڑی نرگسی آنکھیں کچھ جھکی جھکی سی۔ دیکھنے میں کمزور مگر چلنے اور حرکت کرنے میں ہَوا سے باتیں کریں۔ آنکھوں کے ڈھیلے ہر وقت تر و تازہ رہتے ہیں۔ پتلیاں خوب سیاہ، اور بڑی بڑی جن کی چاروں طرف بڑے بڑے مڑے ہوئے سیاہ گنجان پلکوں کا جنگلہ ہے جس میں یہ وحشی ہر وقت رم کرتے رہتے ہیں۔ بھلا کہیں اس جنگلے سے یہ کالے شیرازی کبوتر اُڑ سکتے ہیں، نہیں آناً فاناً میں دور دور کے کاوے کاٹ آتے ہیں۔ بوا، آنکھیں کیا بتاؤں، غضب کی ہیں موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اُن سے حجاب و شرم و حیا اور عصمت و عفت پڑی برستی ہے۔ یہ دیکھ لو کہ شہر شہر ملک ملک اکیلی پڑی پھرتی ہیں، ہزاروں لاکھوں مردوں میں اٹھتی بیٹھتی ہیں، چاہیئے تھا کہ دیدے کا پانی ڈھل جاتا مگر نہیں؟ آنکھ میں وہ حیا ہے کہ بعض بے حیا مَردوں کی طرف اُٹھتے ہی اُن کو بھی حیا دار بنا دیتی ہے۔ یہ باہر کا پھرنا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ گھروں کی چاردیواری کے اندر پڑے پڑے پردوں میں گڑدے لگائیں ورنہ بیوی ہم نے حاشا للہ حاشا رحمٰن کوئی اُن کی ایسی ویسی بات سُنی۔ تناسب اعضا ہیں، چھب تختی بڑی پیاری ہے جس کے سبب جامہ زیبی اور بھبن غضب کی ہے، کان موزوں ہیں، اور لویں نیچے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جھکی ہیں، بال بڑے گھندار کالے بھونرا سے ہیں اور انگریزی موجودہ طرز کے موافق کنپٹیوں پر جھکا کر اور کانوں پر سے لے جا کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کالی کنگھیاں لگائی گئی تھیں جن میں ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے سفید نگ جڑے ہوئے تھے جو مہین بنارسی ساڑی کے اندر سے پٹ بیجنوں کی طرح جھم جھم کر رہے تھے

بالوں کی وضع تھی تو انگریزی مگر ہماری محمد شاہی پٹیوں اور سادی بریوں سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے۔ بائیں رخسارے پر ذرا کچھ اوپر ہٹ کر ایک ننھا سا ہلکے سیاہ رنگ کا تل ہے کہ جب ہنستے وقت گال اوپر کی طرف بڑی خوبصورتی سے تلاطم پیدا کرتے ہوئے چڑھتے ہیں تو شامت زدہ آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ سیدھے رخسارے میں ہلکا سا گڑھا پڑتا ہے جس کی بابت دلّی والیوں کا خیال ہے کہ ساس پر بھاری ہوتا ہے۔ چوکھٹا موزوں، برابر برابر۔ جمی ہوئی خوب چمکتے ہوئی بتیسی جیسے بحرین کے موتی، ہونٹھ جو ہنسنے اور مسکرانے میں ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں اور پھر کچھ وقفہ کے بعد مل کر بالکل وابستہ ہو جاتے ہیں پتہ دیتے ہیں کہ یہ عورت بڑی برداشت اور تحمّل کی ہے۔ رکھ رکھاؤ اور اپنے تئیں لیئے دیئے رکھنے کا بڑا مادّہ ہے کوئی راز کی بات کہدو تو گویا کوئیں میں ڈال دی یا یوں سمجھ لو کہ وہ زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ ہم نے آج تک کوئی چھچھوری، پوچ، بیہودہ، اور لغویات اپنی میں سے باہر نہیں جانے دی پہلے ہم سا کنانِ دل و دماغ کا جھاڑا لے لیتے ہیں پھر نکلنے دیتے ہیں، خوبصورت ٹھوڑی جیسے بنارسی لنگڑے کی کیری مورنی کی سی گردن، گول سڈول بازو جیسے ملبوتری سانچے میں ڈھلی باہیں، اچھّی گول گول نازک کلائیاں، جن میں پھنسی پھنسی چمکتے ہوئے زبرجدی رنگ کی جاپانی ریشمین چوڑیاں، بیچ میں نیم کے پھول کی بیبئی کی جلادار اشرفی کے سونے والی چوڑی، اور پھر ریشمین چوڑیوں میں ملی ہوئی اِدھر اُدھر ایک کے بعد ایک، بائیں کے ڈروالی وہی سرخی لیئے اشرفی کے

سونے کی تیلی تیلی نخیں لگی ہوئی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ گلے میں ست لڑے کی سی وضع کی کنٹھی تھی جس میں جگنی کی جگہ یاقوت کی آوازدار جڑائی کا چاند اور پکھراج کی جڑائی کا تارہ سا لگا ہوا تھا۔ کانوں میں ہیرے کے چھوٹے چھوٹے بندے تھے جو بجلی کی روشنی میں حرکت کے ساتھ بڑے جھم جھم کرتے تھے۔

بیگم نیڈو کے کانوں کو دیکھ کر اللہ بخشے دادا سو بھابا دا آگئیں جو کہا کرتی تھیں کہ اے ہے! عورت کا حسن ہی کیا جو اوپر کے سب کان نہ چھدے ہوں، نرے نیچے کے ایک ایک یا دو دو کان چھدے ہوں تو عورتیں تو لگتی نہیں، خاصے بھانڈوں کے ساتھ ناچنے والے لونڈے معلوم ہونے لگتی ہیں۔ صورت ہی نہیں نکلتی جب تک کہ نرم نرم کان گونبی کی طرح نہ جھکے پڑتے ہوں اور جو بیویاں مارے نزاکت کے گہنا پاتا نہیں پہنتیں تو لوگو! چاہے مجھے کوئی بدشرم کہے یا بے حیا اس بندی کو وہی میاں مراد کے چوتڑ جیسے چاند سا دہ سادہ روڑ ہا روڑ ہا موتھ لگنے لگتا ہے۔ چاہے کتنا ہی گورا چٹا کیوں نہ ہو۔ خصم بھی بات کرتے بجیا رے، موئے ہمزاد کا دھوکا کھائے اللہ غریق رحمت کرے کیا اگلے لوگ بھی تھے اور کیا تھے ان کے خیال، بہشتن کسی کو بھی ذرا ہلکا ہلکا سا زیور پہنے دیکھ لیتی تھی تو کوئی نہ کوئی چوٹ ضرور ہی کردیتی تھی اور ہم بہنوں میں سے تو اگر کوئی ذرا بھی گھبرا کر ایک بھی چیز علٰحدہ کردیتی تھی تو ہماری جان سے دو، چار یار پنجتن پاک کا قدم درمیان، بیچاری کی ارواح نہ شرمائے، بلا کی طرح ہاتھ جھاڑ کے پیچھے پڑ جاتی تھی، اور جو نہ کہنی تھی وہ کہہ سناتی خیر بیچاری

اب ہم سے اچھے لوگوں میں ہو۔ اللہ ان کی اچھی بنائے یہاں تو اچھی کاٹ ہی دی۔
کہتے ہیں کہ مر کے پاؤں پھرے اس نے تو مر کے بھی پہرہ دیا۔ یاد ہوگا۔ شتابو کی اس
رات کیسی گھگھی بندھی تھی اور کیسی چیخی چلائی ہی اور پوچھتے تھے کہ اری مردار بتا کیا
آفت ہی سر پہ میراں آئے ہیں یا ماموں الٰہ بخش چڑھ بیٹھے ہیں، کوئی چھل پیری دیکھی یا
تیرے مرے پیاروں نے آ لیٹو ادبایا۔ کچھ جواب نہ دیتی تھی۔ بیری کی طرح تھر تھر سر سے
پاؤں تک کانپتی تھی، بات کرتی تو منہ سے پورے لفظ نہ نکلتے، آخر جب خالہ مغلانی
نے قرآن شریف کی، واری جاؤں نام کے، ہوا دی اور استانی جی نے پنجسورہ
اور لعل خانم بوڑھی بان کی ماں نے لایلاف پڑھ کر دم کیا جب قطامہ کے اوسان
درست ہوئے، موہنہ سے پھوٹی، کہ منجھلی سرکار للہ میری خطا معاف کریں مجھ سے بڑی
چوک ہوئی۔ حضرت بی بی کے بچوں کا صدقہ درگزرو۔ جب اماں جان نے بگڑ کر کہا
کہ شفقت صدقے واسطے ہی دلائے جائیگی یا کچھ کہیگی بھی، تو کس طرح چبا چبا کے کہا ہے
کہ سرکار عالیہ، میں نے منجھلے سرکار کی گڑے کی جڑائی والی، ہیرے کی آرسی صبح
فجر ہی نور ظہور کے تڑکے چھوٹی مہتابی والی صحنچی میں سے جب پلنگی آفتابہ اور لال کھاسے رو
کا زیر انداز اٹھانے گئی۔ یہ نگوڑی اندر سہار رات کو عشا کے بعد ہی میں بھول آئی تھی
تھا تو سویرا ہی میرا کلیجہ بھی کھرچ رہا تھا، میں نے کہا کہ دیکھوں کچھ رات کا بچا کھچا کھچنیر
دھرا ہو تو لے جا کر بیٹا دوں۔ ناگہانی ہونی شدنی کنگھا و ٹیکہ لگتا تھا اٹھالی،
میرا اللہ گواہ ہے جو کوئی بھی نیت میں خلل ہو۔ ادھم اس کی بیچ ہی کی ادرحا فقط جی

بدھنی کی فال کھولینگے دیکھوں کس کا نام نکلتا ہے۔ سنّو جی کی بیٹی کس کا حلیہ بتلاتی ہیں،
حضور یہاں سرکار ریں ایسی بے پروا ہیں کہ کسی نے پلٹ کر سُدھ بھی نہ لی۔ جھٹ بیٹے
کے وقت سے مجھے خیال ہوا کہ کچھ ذکر نکالوں اس کی بابت، پھر میں نے کہا کہ مجھے
چپ ہی سادھ لینی چاہیئے، دوسرے مجھے ملمع تولنا تھا اور مودی خانہ میں رکھنا تھا
ادہر نانی فتن نے سارا محل سر پر اُٹھا لیا کہ لوگو! غضب ہے جس سرکار دربار میں پرچھی
کی پرچھی بھری ہو۔ ہتھیلی کا پھپھولا نہ پھوڑیں، ہلکے پانی نہ پئیں۔ نگوڑے سب کے
سب بادشاہی احدی ہو گئے کہ ہلاؤ نہ جلاؤ، ٹکڑے ناگ ناگ کھلاؤ۔ کھائیں اور
مگرائیں۔ کرموجلیاں انعام اکرام کے وقت تو کیا کیا پل پل کے دشمنوں، بیریوں
کی جان پر آتی ہیں، ایک ایک ہے کہ اپنا حق خدمت جتاتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی ڈھنگ
ہے، کوئی ریہ ہے، کوئی قرینہ ہے۔ کہ دونوں وقت ملنے کو آئے اور جنس اب تک باہر
نہیں گئی۔ اب بھلا کس وقت وہ نانا کرموں بندہ جنس سنبھالیگا اور کب پکار ریندھ کر فارغ
ہوگا، پھر وہی مدّعیوں کی جان پر سرشام ہائے ہائے ہو گی، یہ معصوم معصوم پھول
سے بچے خالی انتڑیوں ان نمک حراموں کی جان کو دعا دیتے ہوئے آرام کرینگے۔
اسی طرح نواب کی جس کے دم کی ساری راون بھادن ہے۔ ان ممتانی کے کلیجے میں
چھری کٹاؤں ڈالنے کو وقت سے بے وقت کھانے کے مارے بھوک ماری جائیگی۔
بس کچھ یونہیں سا جی جم کھائینگے۔ ان مال زادیوں کے گھر سے ہیں، سارا اُلٹش
اُنھیں عجیبانیوں کے ماتھے میں گھسیڑیگا۔ سرکار عالیہ میں جلدی جلدی جنس تول جھوتک

فرخندہ کے ہاتھ باہر باورچی خانہ میں بھجوا نانی فتن کی بھیجا بھیجا اور تھوک بیک اُڑتے
دیکھنے چھوٹی سہ دری میں چلی گئی وہ سب مجھے دیکھ کر اور تیز ہو ہنٹیں اور آئیں تو جائیں کہاں
ایک ایک گالی سوا سوا من کی دے ڈالی اور میں جب ہنسی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئی
پیٹ میں بل پڑ گئے تو اور بھی آپے سے باہر ہوئیں پن کٹی چٹخ ناک کے بانسے پر عینک
کو رکھ اور اُس کے ڈوروں کو پیچھے چٹیا کی طرف کھسکا لکڑی ٹیکتی اُٹھیں کہ بھلا
رہ تو سہی خام پارا میں خود نواب پاس چھوٹی محلسرا میں جاتی ہوں ورقسم ہے مجھے تیس
دھار دودھ کی جو نواب پر نثار کیں اور طلاق ہے اس بندی کی جلتی پہ جو تری پوری
طرح کدبدیا نہ بنوائی۔ ٹھیر جا بڑی چربیا گئی ہے۔ ابھی آن کے آن میں سدھر وا کے
دیتی ہوں۔ میرا بھی فتح النسا نام نہیں۔ اپنے نام کی میں بھی ایک بندہ بشر ہوں کسی
مغل کی ہنیں چمار کی جنی کہیو جو تیرے سارے مغز کی گرمی نہ چھٹوا دی وہ رسیوں سے
بندھوا سائیسوں سے جوتیاں نہ لگوائی ہوں کہ تو بھی کدھی کو یاد کرے، لنکا کہیں کی
چوٹی جمع مسجد کی سیڑھیوں پہ کی شہدن، اُڑوا بیگنی۔ اوخو کیا کیا تھرکتی ہے۔ کیا کیا
کلیں توڑتی ہے۔ بوٹی بوٹی پڑی ناچتی ہے۔ خاک پہ بسم اللہ، اللہ نے دیکھے ہی ٹینچا
ہے۔ دیکھتی جا وہ چار چوٹ کی مار پٹوا اُوں کہ بند بند ڈھیلا ہو جائے کھڑی کھڑی کہرا
ناچے۔ اب تو ہی اس گھر میں پراج لے یا میں رہ لوں۔ سرکار عالیہ! نانی فتن نے جو
سرکار حضور سے شکایت کی دھمکی دی میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے زمین کے
سر سے ٹٹولتی تھی۔ نانی فتن کے آگے ہاتھ جوڑے، توبہ کی، ناک رگڑی، اللہ رسول

سے کیے واسطے دیئے، ہزاروں خوشامدیں درامدیں، منّت سماجتیں کیں تب کہیں خدا خدا کرکے
ان کا جوش اُترا۔ غصّہ ٹھنڈا ہوا۔ نرم پڑیں، بیسیجیں۔ چھوٹی حویلی میں تو نہ گئیں مگر وہاں
بڑبڑ بڑبڑ گھنٹوں کرتی رہیں۔ پھر میں اُٹھ دیرے میں خالہ ہنّو کے پاس جا بیٹھی، چھالیہ
کترا، ایک زردے کا ٹکڑا کھایا، اتنے میں خاصے کا وقت آیا، لکھو سیر جن بھنگی سنبھال پتیلیاں
لینے ڈیوڑھی پر گئی میں نے شیدی کو پھلکوں کا آٹا رکوانے باہر دوڑایا۔ اور خود بھی
رحمت کے پاس کھانا اُتروانے نعمت خانے کے قریب جا بیٹھی وہاں کچھ بیٹھے بیٹھے نیند
سی آئی۔ سوچی کہ تو نے ابھی صبح کے خرچ کو صراحیاں آب دار خانہ میں سے نکال کر
بچھیروں پر نہیں دھری ہیں۔ اس کام سے نچنت ہو کر سو رہوں گی۔ اتنی بھی ہمّت نہ پڑی
اپنے حصّے کی روٹی اور تصرّف کا سالن دادی دلہن کی پوتی سے لے لینے کو کہا اور
اور اس سے آب حیات کو نکالنے اور بچھیروں پر رکھنے کو جتا جا کر پڑ رہی۔ سرکار تعالیم!
ذرا کی ذرا ہی آنکھ جھپکی ہوگی دیکھتی کیا ہوں کہ ایک بڑھیلا منہ میں دانت نہ پیٹ میں
آنت آئی اور میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ بہتیرا اسے دونوں دونوں ہاتھوں سے
ہٹاتی ہوں، پاؤں بھی مارتی ہوں، دھکیلتی بھی ہوں مگر وہ مریم سے ٹس نہیں ہوتی
آخر اسی ہشت مشت میں اس نے میری گردن کی طرف ہاتھ بڑھا ٹھوڑی پر رکھ دیا اور
کہا کہ چھوٹی چنبلی میری بچی کی آرسی ابھی اس کے حوالہ کرو ورنہ مونڈیا مروڑ کر رکھ دوں گی
سرکار میرا لہو خشک ہو گیا چیخنے کی کوشش کرتی تو آواز نہ نکلتی۔ پھر میری آنکھ کھلی تو
آپ لوگوں کو دیکھا۔ لیجیے یہ رہی آرسی۔ یہ کہہ نیفے میں سے نکال حوالے کی ناتی

حضرت بڑی ناراض ہوئیں۔ کہنے لگیں فو وف ہے، لعنت ہے، تجھ پہ خدا کی دیکھا مرد ا رجنے کا مزا۔ وہ بے غیرت، دھویا دیدا، چکنا گھڑا، بوند پڑی پھسل گئی، بیٹھی ہنستی رہی۔ ہم لوگ تو پھر چلے آئے۔ صبح اس نامراد نے بیچاری دداسو بھا کی فاتحہ پھلی کی دھوون ماش کے بڑوں اور انڈوں پر دلوا دی۔ اس روز سے پھر کسی کے خواب میں نہیں آئیں مگر دیکھو پھیرا مرے پر بھی دیا۔ میری کوئی چیز اِدھر سے اُدھر جا سے لے جا ہو جائے یا ذرا بھی میں خود آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤں بس دیوانوں کی طرح سڑی سودائیوں کی طرح ہو جاتی تھیں۔ اے ہے دیکھو! اچھوں کی یاد مرنے کے بعد بھی ہوتی ہے۔ سچ ہے جام پیارا نہیں کام پیارا ہے۔ لو میں نے بھی بات کہاں سے کہاں لا ڈالی۔ کہاں بیگم نیڈو کا سراپا کہاں اِن کی جان سے دُور دداسو بھا کا رونا صورت اور زیور سے تو آشنا ہو گئیں اب لباس اور اور جو باتیں ان کے متعلق رہ گئی ہیں سب آگے چل کر بتائے دیتی ہوں۔

کنارے دار ہلکے موتیائی رنگ کی بنارسی ساڑھی۔ کنارے پر مفنٹے کی بیل اور تین پر برت کی بوٹیاں پڑی تھیں چولی مرہٹی تراش کی تھی۔ جس کی آستینیں خوب پھنسی پھنسی آدھے بازوؤں تک تھیں۔ چولی کا کپڑا بنارسی تھا جس کی زمین پہ پاس پاس گلاب اور موتیے کی سنہری بوٹیاں پڑی تھیں اور اس پہ کنارہ جو لگایا تھا وہ بھی بنارسی جس کی بیل خدا جانے کس قسم کے جال کی تھی۔ لیکن چولی کا رنگ اور ٹکائی ساڑی ہی کے جواب کی تھیں۔ ساڑی بمبئی کے طرز سے بندھی تھی۔ چاروں طرف خوب اچھا

مٹھا مٹھا جھول دیا ہوا تھا۔ لیکن اوڑھنے کا سرا معمولی ساڑیوں سے بڑا تھا۔ جس کے آنچل کو الٹے کھوے پر مہین مہین چنٹ دے کر اور پھول سوئی اٹکا کے سر پر سے لیجا کر پیچھے نیچے تک لٹکتا چھوڑ دیا تھا۔ جس سے پچھائے کی ڈھکن بڑی خوبی سے ہوگئی ہے اور بمبئی کی عام ساڑیاں جو پارسنیں باندھتی ہیں کہ پلّو کا ایک سرا لیکر داہنے پہلو کی لپیٹ کے بعد گائی کے نیچے سے بائیں پہلو کی طرف اڑس لیتی ہیں اور دوسرا سرا پیچھے سموسہ نما لٹکا رہنے دیتی ہیں اس میں وہ بات نہ رہی تھی (یعنی پیچھے سموسے کی طرح نہیں لٹکتا تھا) بلکہ دونوں سرے پیچھے ہی لٹکے ہوئے تھے۔ کان کے پاس کچھ سرگاہ کے آنچل کی جھوک تھی۔ جسکو سروجنی صاحبہ اکثر بولتے وقت عجیب انداز سے داہنے کان ورہنسلی کا سرا ڈھانکنے کے لیے بڑی پھرتی سے جھکا لیتی تھیں جسپر حرکت سے آہستہ آہستہ کھسک کر پیچھے ہٹ جاتا تھا اور پھر وہ چٹکی سے پکڑ کر آگے کھسکا لیتی تھیں۔ پاؤں میں پیر سے اونچی ایڑی کی سیاہ بیگمی جوتی تھی۔ جس وقت یہ تقریر کرنے کھڑی ہوئی ہیں اس وقت کا عالم بیان سے باہر ہے۔ آواز میں ایک خاص قسم کی لرزش تھی جو دلوں میں لرزش پیدا کرتی تھی۔ کبھی تو آواز رساں رساں اوپر چڑھ کر مہادٹ کے بھوتے بھورے بادلوں کی سی گرج پیدا کرتی تھی اور کبھی آہستہ آہستہ نیچے ہو کر ساون بھادوں کی باجرا پھوار کا مزا دیتی تھی۔ اور کبھی ایک جگہ قائم ہو کر سننے والوں کے دلوں کی متحرک موجوں میں چاند کے غیر مستقل عکس کا مزا دے جاتی تھی۔ یا یہ معلوم ہوتا تھا کہ گل مشکی کے تختے میں سونے موتیوں کا ہزارہ چھوٹ رہا ہے جس کی صدہا پتلی پتلی دھاریں لبے پاس ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ملی

ہوئی نکل کر اور اوپر پھیلتی ہوتی اور ایک دوسرے سے دُور ہوتی ہوئی اور پھر ایک خاص
قسم کی محراب بنا کر پھولوں کی نازک نازک کالی پنکھڑیوں پر گر کے اور تھوڑی دیر ٹھہر کر
اور اپنی چمک دکھا کے چھوٹے چھوٹے موتیوں کی ٹوٹی ہوئی لڑیوں کی طرح تختے میں
چاروں طرف بکھر جاتی ہوں۔ جس وقت وہ جوش میں آن کر سر کو حرکت دیکے گردن کو
اکڑاتی تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ بارش سے دُھلے ہوئے ہرے کنج سے جنگل میں ہرنی
ہوا کے رُخ کھڑی کستوری کی بُو لے رہی ہے۔ لفظوں کو پُرزور اور پُراثر بنانے
کے لیئے جب وہ مٹھیاں بھینچ کے اور ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کے پھر جو اکڑاتی تھیں اور جھومتی
تھیں تو معلوم ہوتا تھا کہ سطحِ آب پر کنول کی تیرتی ہوئی بیلوں میں جل پری راج ہنس
کے ساتھ کھڑی اٹھکھیلیاں کر رہی ہے۔ پھر خاتمۂ تقریر کے بعد ان کا ایک دم فوراً ہی بیٹھ
جانا اور دیوان میں تالیوں کا شور اور حاضرین کی چرغم چرغم بالکل جل پری کے
کھیلتے کھیلتے دفعتاً غوطہ لگا جانے اور جل کوؤں کے شور و غل کے مانند تھا۔ یا
ان کا جھومنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہری ہری دوب کے جنگل میں چاندنی چٹک رہی
ہو اور ہوا کے جھونکے سے ہلتے ہوئے پتّوں کی اوٹ میں بیٹ بجنوں کی چاندنی کے
سامنے مدھم مدھم چمک میں ایک دور کسی چٹان پر بیٹھے ہوئے گڈریئے کی بین کی آواز
پر کیچلی پھاڑ کر نئی نکلی ہوئی ناگن کا پھن پھیلا کر کھیلنے یا کسی گاؤں سے رات کے سناٹے
میں ٹونگی کی آنے والی لہریہ لہرا لینے کی مانند تھا۔ اور پھر بولتے بولتے آناً فاناً
ہیں کچھ جسم کو ڈھیلا چھوڑ کے کرسی جو جگہ کی تنگی کی وجہ سے پیچھے ہٹائی گئی تھی تاکہ

انھیں کھڑے ہونے میں سہولت ہو اور اس کا ہٹایا جانا انھیں یاد نہ رہا تھا۔ ایک پاس ہی پڑی ہوئی چوکی پہ بیٹھ جانا۔ لہرا بند ہونے پر ناگن کے پھن سکیڑ کے پتّوں پہ سے اوس چاٹنے کی طرح تھا۔

اور ہاں جب ہمارے کالج کے مشہور شاعر سہیل صاحب نے فارسی کا قصیدہ پڑھا ہے۔ اس وقت بیگم نیڈو کی پتلی پتلی انگلیاں خود بخود تال سم کے ساتھ کرسی جس پر وہ بیٹھی تھیں پڑنے لگیں۔ ایک تو قصیدے کے الفاظ ایسے تھے کہ جن کے ادا کرنے میں خود بخود ایک راگ کی سہانی آواز نکلتی تھی۔ پھر لفظ بڑے فصیح شان شوکت کے بندش انوری اور قاآنی کی بندش سے بالا جمائے۔ سونے پہ سہاگہ سروجنی صاحبہ کی انگلیوں کی حرکت نے غضب کا سماں باندھ دیا۔

اچھی۔ کھوگی تو سہی کہ دو تین سب کی صورت بتائی لیکن سہیل صاحب کی بابت کچھ نہ بتایا۔ لو سنو، ایک مٹھی بھر کا سوکھا سہا مردوا، ہڈیوں کی مالا، مرزا منخنی، ہلکا پتّا پھونک سے کوسوں دور جائے۔ بنارس کے پاس جو اعظم گڑھ ہے جہاں کے شبلی مرحوم رہنے والے تھے وہیں کے یہ بھی رہنے والے ہیں۔ ان کی شاگردی کا بھی انھیں شرف حاصل ہے۔ مگر بڑے میاں کی ارواح بھی ایسے قابل آدمی کے شاگرد ہونے پر ناز کرتی ہوگی۔

اے ہاں ایک بات اور یاد آئی۔ جس وقت سروجنی صاحبہ بول رہی تھیں تقریر ساری تھی انگریزی میں۔ اور انگریزی وہ زوردار کہ خود انگریز منھ تکیں۔ کہ یا اللہ

کوئی رحمت کا فرشتہ ہی یا آزادی کا کہ کھڑا بول رہا ہی۔ سارے لوگوں پہ وہ سنّاٹا
جیسے اگن چھکے اور سارے پرند چپکے ہو کر بیٹھ رہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ
چل تو نے تو کئی دفعہ سنا ہی آج اور سننے والوں کا تماشہ دیکھ۔ اب میں نے جو لوگوں
کی طرف آنکھیں دوڑائیں، کسی کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اور کسی کا
مُنھ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ایک انگریز ذرا موٹا سا، سُرخ سُرخ لال چقندر سا رنگ
زرد زرد دانت نکوسے، مُنھ پھاڑے ایسا مبہوت ہو کے بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا
دشمنوں کو سانپ سونگھ گیا۔ اُسے ہی کچھ عجیب ہی بے چارے کی صورت بن کے
رہ گئی تھی کہ دیکھے سے ہنسی آتی تھی۔

حامد دیوان اور مُباحثہ

پندرہویں کو دوپہر سے کوئی گھڑی بھر دن رہے تک یونیورسٹی کی ہڑ گم ہڑ گم رہی
خدا خدا کر کے اس کا بھی جھگڑا چکا، ساڑھے آٹھ بجے رات کو حامد دیوان میں مجلس
اتحادیہ کا جلسہ ہوا۔ حامد دیوان نواب حامد علی خاں صاحب والیِ رامپور نے شاید ۱۳۲۹ھ
میں بنوایا ہی۔ انھیں کے نام پر اس کا نام حامد دیوان ہی۔ گمہ اینٹ کی چنائی ہی باہر
رُخ تین طرف چار پانچ سیڑھیاں چڑھ کر برامدہ ہی۔ دروں کی محرابیں سیدھی نوک دار
ہیں۔ پورب پچھم جانب دیوان کے داخلے کے تین تین دروازے ہیں۔ جن پر ڈھلائی
چبوتریاں چڑھی ہیں دیوان میں داخل ہو کر اگر دکن کی طرف مُنھ کریں تو فرش ہی

کوئی گز بھر کی کرسی دے کر، پختہ چبوترا بنایا ہے۔ اسی چبوترے پر میر مجلس کی میز کرسی اور اُن کے سارے عملے کی نشستیں ہیں چبوترے سے اتر کر کوئی گز ڈیڑھ گز کے فاصلے کے بعد سے نشستیں شروع ہو گئی ہیں۔ جو آگے پیچھے ایک سے ایک اونچی ہوتی چلی گئی ہیں دیوان کے اندر چار طرف سنگین ٹوڈیوں کا چھجّہ ہے جس پر لوہے کا کٹہرا لگا ہے۔ اور اس طرح اندر چاروں طرف بڑی خوبصورت غلام گردش بن گئی ہے۔ ٹوڈیوں پہ گلابی رنگ بھرا ہے پتّے کی کھدائی ہے، ٹوڈیوں کے لٹو کٹو گٹّے کی تراش کے ہیں اور ان پر سنہری رنگ بھرا ہے۔ سنگین چوبندی جس کے کنگورے کی بیل کچھ میٹھے تیلئے کے رنگ کی ہے۔ ذرا مردوں کے رنگ کے مذاق اور آمیزش کو غور کرتی جانا۔ اللہ رکھے دیوان کے دیواروں کو اودے، لال، سبز حریری کاغذ کے چاند تاروں سے سجایا ہے جس سے دیوان خاصی دیوالی کی کلھیا معلوم ہونے لگا ہے۔ یا کہیں کہیں کاغذ کو تنکوٹا کتر کر بندھن دار بنائی ہے۔ وہی نگوڑا تین ترنگا، کلیجی پھیٹرا اسا رنگ، بندھن وار کی وضع دھجیوں لگے گدڑی پوش فقیر کی سی ہو گئی ہے۔ اتنا بڑا جلسہ چاہیئے تھا کہ پھولوں کے بندھن وار لگاتے دیوار گیریاں بھی پھولوں کی ہوتیں۔ تو دیوان مُنھ سے بولنے لگتا۔ دیکھنے والوں کے بھی دل کی کلی کھلتی۔ بجلی کی روشنی تو ہے مگر پنکھے وںکھے ندارد، بجلی کی روشنی بھی ابھی فضل امین صاحب کے عہد میر مجلسی میں آئی ہے۔ ورنہ پہلے تو وہی ریوڑی والے کا چراغ، لٹکواں لیمپ ٹمٹمایا کرتا تھا۔

اب یہاں کے جلسہ کا حال سنو۔ جب راجہ صاحب محمود آباد اور بیگم نیڈو دیوان میں داخل ہوئیں تو بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ غلام گردش میں سے اور چاروں طرف سے بھر بھر مٹھی لڑکوں نے وہ پھول برسائے کہ تودے کے تودے لگ گئے۔ لیکن پھول نگوڑے تھے جھڑاں گیندے کے، بیگم نیڈو اور راجہ صاحب کے گلے میں ہار ڈالے گئے، وردی فوج ہار کہتے مجھے وہم آتا ہے۔ پھول مالا، مگر یہ بھی گیندے کے۔ راجہ صاحب کے گلے میں شاید ایک گوٹے کا بھی تھا۔ اس رات بیگم نیڈو کا لباس دوسرے رنگ کا تھا ہلکی پیازی سیلیاں کریپ کی ساڑی شاید تانا پیازی اور بانا چمکتا ہوا آبی تھا۔ جاپانی ریشمین ریز کی چولی تھی کہنیوں تک کی آستین کی۔ چولی کی زمین سفید تھی اور گلابی پھولوں کے گلدستے تھوڑی تھوڑی دور پر بکھرے ہوئے تھے۔ ساڑی اور چولی پہ بیل گنگا جمنی کیلی کانٹے کی کنگورے دار تھی۔ کیلی کانٹے میں جرمنی کے سنہری مصالح کے ستارے تھے۔ ساڑی میں کھوے کی چینٹ پہ سونے کی پھول سوئی تھی۔ پھول کی وضع دو کسی انگریزی درخت کی پتیوں کی سی تھی۔ جن کی ڈنڈیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں اور ایک کلی ان پہ دھری تھی، پتیوں کا میتا انگوری رنگ کا تھا اور کلی کا شاید ہلکا نارنجی، رات میں کچھ اچھی طرح تمیز نہ ہو سکی۔ ہاتھوں میں وہی سونے کی اور ریشمین چوڑیاں تھیں جو پہلے بتا چکی ہوں گلے میں ست لڑے کی بجائے چاپ تھا جس میں پکھراج اور فیروزے وغیرہ جڑے ہوئے تھے۔ جب کالج کی طرف سے

کنٹھا گلے میں پڑا ہی تو یہ بڑی متانت اور وقار سے نائب میر مجلس کے بائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

گیندے کے کنٹھوں اور پھولوں سے میرے خیالات ہندوؤں کے فسانوں کی طرف جا رہے تھے۔ کیونکہ ان پھولوں کا استعمال وہی لوگ تیج تیوہار اور پوجا پاٹ کے موقعوں پر کرتے ہیں۔ یا ہم لوگوں میں ٹونے ٹوٹکے والیاں جب پریوں کے طباق چڑھواتی ہیں تو کام لاتی ہیں۔ مجھے معًا بیگم ہینڈ کو دیکھ اور اُن کے دکنی ہونے کے خیال نے ستیاجی اور کالج کے لڑکوں کو کالے کالے ترکی تنے پہنے ہوئے دیکھ کر راون کی ستّیا کا خیال آیا۔

راجہ صاحب محمود آباد سے انجمن کے اعزازی رُکن ہونے کی درخواست کی گئی جو اُنھوں نے نہایت شفقت سے قبول فرمائی اور اپنا نام انجمن کے اسم نامہ میں لکھ دیا۔ اِس کے بعد تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ بڑی سیدھی سیدھی وضع کے آدمی ہیں۔ درمیانہ قد اچھے خاصے وجیہہ معقول صُورت، بارُعب چہرہ لمبا بالکل سادہ۔ لکھنؤ کی سفید دوپلڑی ٹوپی، بیل کا حاشیہ، سفید شروانی۔ خوب پھنسا ہوا، آڑا پاجامہ، پاؤں میں سیاہ انگریزی منڈا، آواز بڑی پُردرد اور بھرائی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دل بھرا ہوا ہے اور ذرا سے ٹھوکے کی دیر ہے تسلّی دلاسے کی باتیں کرتے رہے۔ اللہ بیچارے کو جیتا رکھے اور نیک نیتی کا پھل دے۔ مسلمانوں میں ان کا بھی دم غنیمت ہے۔ آئندہ حقوق کی نگہداشت کا وعدہ

بھی کیا ہے۔

ایک مضمون تھا۔ اس وقت کچھ خیال سے اُتر گیا۔ اس پر مباحثہ تھا۔ سیدین صاحب نے تائید کی اور بیگم نیڈ و نے تردید۔ ان کی ہاں میں ہاں عبدالرحمن صاحب سندھی نے بڑی قابلیت اور فصاحت سے ملائی۔ اے ہی یہ بڑے ہنس مکھ ہیں مسکرائے دیتے تھے۔ بات پیچھے کرتے تھے، آگے ماں بہنوں کا کلیجہ سکھی رہے۔ بڑی پیاری مسکراہٹ ہے۔ ان کی تصویر تو تم نے ترکی طبی وفد کے مجمع میں دیکھی ہوگی۔ ڈاکٹر انصاری، اے وہی ڈاکٹر انصاری جن کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں جو ساری دلی میں پیرے ہوئے ہیں، انھیں کے برابر ذرا پیچھے ہٹ کر دائیں ہاتھ کو کسی ترک کے کندھے پہ ہاتھ دھرے سندھی صاحب کھڑے ہیں آنکھوں پہ خوبصورت سی سونے کی عینک لگی تھی۔ چہرے کا رنگ کمانیوں کا رنگ ایک سا ہی ہے۔ بس کمانیاں اس وقت چمکتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جب ذرا مسکراتے ہیں اُن کے چہرے پہ ہلکی ہلکی سرخی دوڑ جاتی ہے۔ اس وقت تو کمانیاں معلوم ہوتی ہیں نہیں تو اُن کے دمکتے ہوئے رنگ کی ہم رنگ ہی ہیں۔

یہ بحث بھی بڑی مزیدار رہی۔ بنت نذر الباقر صاحبہ کے میاں سجاد حیدر صاحب جن کا ہاتھ تم نے سنا ہوگا شیخ پورہ کے پاس اب سے دو برس گاڑی کے پاس سے گزرتے ہیں ٹوٹ گیا تھا۔ یہ بیچارے بھی کچھ بولنے کھڑے ہوئے لیکن ایک جو سہی تو لڑکوں نے اور اور لوگوں نے بوکھلانے کے لیے سی سی شروع

جس سے یہ اور رہے سہے غائب ہوئے۔ اور حیات صاحب کے اعتراض اور ٹوک نے تو بالکل ہی کھو دیا۔

اے ہاں۔ حیات صاحب کی بابت بتانا تو بھول ہی گئی۔ یہ ہماری دانشگاہ کے بی اے ہیں اور اسی دانش گاہ کے متعلق مدرسے، اس میں اُستاد ہیں۔ ہیں تو ستلج پار کے مگر معلوم لکھنؤ کے بانکے ہوتے ہیں۔ دُبلے پتلے منحنی سے گیہواں رنگت لب و لہجہ بات چیت سب درست ہندوستانیوں کی سی، آن ہوا دیکھکر دھوکا کھائے اور ہندوستانی سمجھے، گمان بھی تو نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص پنجاب کا ہے۔ البتہ چال میں جو اکھڑپن اور بے پروائی ہے اُس سے تو پتا چلتا ہے کہ گھٹی میں راوی کا پانی ملا ہے۔

دو قصیدے اُردو میں دانش گاہ کے دو شاعر ہیں اُسے ہی کچھ بھلا سا ہی تخلص ہی ایک شاید ایوب احمد آثم اور دوسرے بدر جلالی، اُنھوں نے پڑھے، پڑھنے کا طرز دونوں کا جُدا تھا۔ لیکن قصیدے دونوں بہت اچھے تھے۔ آخر میں خواجہ عبد المجید صاحب بیلسٹر نے جو بڑے لڑکوں کے سکتر ہیں، کالج کے لڑکوں کا شکریہ ادا کیا۔

اے خواجہ صاحب کو تو جانتی ہو گی۔ خواجہ یوسف صاحب مرحوم کے لڑکے ہیں۔ جن کی عزیز داری تمہارے ہیں ہمارے گھر سے شاید پانچ چھ پیسے ڈولی یہ ہے۔ یہ اللہ رکھے دو تین بچوں کے باپ ہیں۔ لیکن چہرہ ایسا بھولا بھالا ہے کہ کنوارے سے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ دُہرا دُہرا قد، بھرے بھرے گلے، خوب صاف شفاف رنگ، سفید شیروانی میں سے پھوٹا پڑتا تھا۔ ان کی تقریر بعد جلسہ ختم ہوا۔

دورانِ تقریر میں بیگم نیڈو برسے ہوئے پھولوں کچھ عجیب بے پروائی اور الھڑپن سے ملتی دلتی رہیں۔ معلوم نہیں کس سوچ میں مستغرق تھیں۔ جب جلسہ ختم ہوا تو یہ اُٹھیں اور ایک گہری قرمزی غلتے کی فرغل پہن چکراتے کی چکور کی طرح لہرلہر کرتی ہوا گاڑی میں بیٹھ اپنی قیام گاہ کو روانہ ہوگئیں۔

ایلو ہاں یہ لکھنا تو بھول ہی گئی کہ جس وقت ہوا گاڑی سے اُتری ہیں اس وقت اُنھوں نے اپنا فرغل گاڑی کی نشست پہ سے اُٹھا کر جھٹ سے سید حسین صاحب کو دیا۔ اُنھوں نے لپک کر پہلے فرغل لیا اور پھر عجیب طرح ہمک کر اور کچھ جھک کر اپنا ہاتھ بڑھایا جس کا سہارا لے کر بیگم نیڈو بڑی ترت پھرت سے جھٹ دینی نیچے اُتر پڑیں۔

اچھی میری امتل! تجھے میری جان کی قسم ہے۔ میری ہی بھٹی کھائے۔ ہمیں تو ہے ہے کر کے بیٹے جو اس خط کو پڑھ کر فوراً چاک نہ کر دے۔ کیونکہ تمھارا بھائی قمرالزماں آفت کا پرکالہ ہے اور یہیں مدرسے میں پڑھتا ہی گھر گیا اور اُس کے ہاتھ یہ خط پڑا۔ تو بڑی مٹی پلید کریگا۔ معلوم نہیں کن کن کو دانش گاہ میں دکھائے لوگ کہیں لکھنے والی بڑی حرافہ ہے۔ میری تمھاری تو بے تکلفی ہے۔ دوسرے تم میری ہم خیال۔ چھٹپن سے ساتھ اُٹھے بیٹھے میری خو بُو سے واقف، مگر اور لوگ تو جانیں کیا کیا حاشیے چڑھائیں، کہو گی کہ اچھی بکواس کر کے مغز چاٹا۔ مگر میں نے تمھیں دِلّی بیٹھے سارے مدرسے کی بہار دکھا دی اور ایسے ایسے لوگوں سے تعارف کرا دیا کہ کبھی کو یاد کرو گی۔ میری اُنگلیاں بھی چلتے چلتے پکا پھوڑا ہوگئیں، ہاتھ شل ہو گیا۔ اب لکھنے کا بالکل یارا نہیں اچھا لو رخصت الله بیلی الله نگہبان۔

سید حسین

باہر سے آئے ہوئے مہمانوں میں تھے تو سینکڑوں ہی لیکن دو تو ایسے تھے کہ بغیر ذکر کیئے رہا ہی نہیں جاتا۔ ایک تو سید حسین بمبئی کرانیکل کوئی اخبار ہے اُس کی نائب مدیریہ دانش گاہ میں پہلے پڑھ چکے ہیں ولایت پڑھنے گئے تھے وہاں سے خاصے انگریز ہو کر آئے ہیں بڑے قابل اور روشن خیال ہیں۔ معلوم نہیں شادی ہو گئی یا ابھی تک کنوارے ہیں۔ چہرے سے تو عمر کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی کوئی چھبّیس بھر کے شاید ستائیسواں لگا ہو۔ سرو ساقد، چھریرا ڈیل، گورا رنگ مگر ٹھنڈا ٹھنڈا ستواں سُواسی ناک، پتلے پتلے خوب صورت نتھنے۔ بیچ کی رأس کی بادامی آنکھیں۔ سیاہ پتلیاں، جن میں موئی وحشت انگریزوں کی سی جو کبھی رام ہی ہونا نہ جانیں حرکات و سکنات بھی ہم سے جُدا بالکل نگوڑے فرنگیوں کی سی، جن سے کچھ عجیب بے قراری ٹپکتی تھی۔ معلوم نہیں کیا جذبات اندر بھرے پڑے تھے جو نکلنے کو تو پھڑک رہے تھے لیکن مصلحت وقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دبائے جانے سے بلبلا کر ایک ایک جوڑ اور ایک ایک عضو میں بے قراری پیدا کیے دیتے تھے۔ ہنسی اچھی، بولتے ہیں کچھ عجیب قرینے سے نیچے کا پتلا ہونٹ ذرا آگے بڑھا لیتے ہیں جو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ داڑھی مونچھ کا صفایا ہے۔ چہرے کی خشونت [illegible] ہے اور نرم نرم بھولا بھولا معلوم ہوتا ہے۔ داڑھی مونچھ سے چہرا ایک حد تک [illegible] اور [illegible]

آجاتا ہے اور اچھی بھلی صورت دل دہلا دینے والی ہو جاتی ہے وہ نہیں رہی ہے۔ مگر ہاں اب دل دہلا نہیں دیتی تو ہلا ضرور ہی دیتی ہے۔ سر چپٹا اور گول پیچھے سے بڑا خوب صورت معلوم ہوتا تھا۔

ایک دن تمہارے دولھا بھائی نے مجھ سے کہا کہ بیگم کہو تو ہم مونچھیں رکھ لیں میں نے کہا کہ ہاں کیا ہے رکھ لو۔ گھر کی کھیتی ہے نئی چیز کا مان گون بھی زیادہ ہوتا ہے اس کے بعد مقدمے میں وہ باہر چلے گئے۔ کوئی دس بارہ دن کے بعد جو آئے۔ تو اسے ہی میں دیکھ کے دنگ رہ گئی کہ دوئی یہ کون مردوا گھسا چلا آتا ہے۔ اوپر کا ہونٹ کچھ عجیب سا موٹا موٹا معلوم ہونے لگا۔ مجھے مونچھوں کا خیال بھی نہیں رہا تھا سمجھی کہ اے ہے شاید کچھ ہو گیا ہے جو رسوت یا جدوار کا لیپ انھوں نے ہونٹ پر کیا ہے۔ جب قریب آئے میں نے سلام کیا غور سے دیکھا تو نگوڑی نمائی مونچھیں تھیں۔ میں نے کہا کہ بخدا تھیں مونچھیں ایک آن نہیں سجتیں۔ للہ ان کو دور کرو اچھی خاصی لشادی کی صورت بنالی۔ مسکرائے اور کہا کہ بیگم تمہاری خوشی سہی عورت کا سنگار میاں کے لیئے اور میاں کا بناؤ بیوی کے خوش کرنے کو ہوتا ہے کسی اور سے نکو انا تو مقصود ہی نہیں ہوتا یہ کہہ اور سنگار خانے میں جا اپنی ہیئت درست کرا آئے۔ اُمتل! میرا منھ نہیں جو میں ان کی تعریف کر سکوں اُٹھی ایسی نیک کوک کا کل جگت کی بیٹیوں کو ملے جو چھپر کھٹوں پر بیٹھی راج کریں

تمھارے دولھا بھائی ولایت کے بی اے ہیں پانچ چھ برس وہیں رہے ہیں مگر یہاں آکر زبردستی کی صاحبیت نہیں جتاتے اور نہ اوروں پہ لوہا تیز کریں نہ زبان ہی کا ستیاناس مفت کے انگریزی لفظ چاروں طرف سے داخل کرکے کیا ہے اور نہ اس زبردستی کی ٹھونس سے لوگوں پہ اپنی قابلیت اور انگریزوں کی خیرا دیریکہ اترے ہوئے ہونے کی دھونس جماتے ہیں اپنا ہی وہی لباس سادہ ہندوستانی عام طور پر ترکی ٹوپی اور حیدر آبادی شیروانی کبھی کبھی دلّی کی اچکن اور چپکن بھی پہن لیتے ہیں۔ گھر کا قرینہ بھی بالکل نہیں بدلا۔ ہم لوگوں کا سا اختیار کیا ہے۔ البتہ دفتر کے کمرے میں تو انگریزی سامان ہے ورنہ باقی سارا مکان دلی والوں کے طرز پر آراستہ ہے ملاقات کے کمرے میں آرائش کے پردے دروازوں پر پڑے ہیں۔ تصویریں مختلف نظاروں کی اور خوب صورت خوب صورت عورتوں کی کہ دیکھے سے بھوک بھاگے۔ قدآدم آئینے آمنے سامنے آویزاں ہیں۔ براق سی سفید چاندنی بچھی ہے۔ چاروں کونوں پر سنگ مرمر کے چار میر فرش کنول گٹے کی تراش کے۔ ایران کا ریشمی قالین کیسکری کے کام کا گاؤتکیہ، داہیں بائیں بڑے بڑے فرشی اگالدان، پانوں کا خاصدان پاس ہی اور برابر ہی زیرانداز پہ چوکی چوکی پہ چھاگل اور تھالی جوڑ کٹورا، اندر دہلیز کے دریچیاں، باہر ولایتی مونجھ کا پاانداز، ان کے یاردوست جو آتے ہیں یہیں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اسی کے ایک طرف دفتر کا کمرہ ہے۔ اور دوسری طرف ایک اور کمرہ ہے جس میں ان کے گانے بجانے

کا سامان ایک ستار، ایک سارنگی، بربط، رباب، طبلے کی ایک جوڑی، ایک پاؤں کا ہم ترنگ (ہارمونیم) اور کچھ انگریزی طرح کی سارنگیاں اور جانے کیا کیا کھڑاگ بھرا پڑا ہے مجھے تو نام بھی نہیں آتے۔ مجھ پہ ظلم ہے کہ میں بھی سیکھوں۔ ہم ترنگ بجانا سکھایا ہے ٹھمریاں سہل سہل سی ہوں تو نکال لیتی ہوں۔ وہ ایک گتیں ستار کی بھی سکھائی ہیں۔ زبردستی ہے کہ بیگم تم بھی گایا کرو۔ میں نے تو بگڑ کر بھی کہا کہ وہ ئی بھاڑ میں جائیں تمھاری بیگم، بیگم کوئی کلاونت بچی ہیں۔ ابّا جان کی وہ بستم بستم تھی کہ ایک دن بھائی محسن کو گنگنانے سن لیا تھا، وہ ڈانٹا وہ بگڑے کہ ساری حویلی کھڑی اور پڑی لرزتی تھی۔ کہ ڈوم بجائے جیپی اور ذات جتائے اپنی۔ کم بخت بدنصیب جس پہ پچیس بچیس کے استاد نوکر ہوں وہ اور کیا سیکھے گا سوائے اس کے۔ برسات ہوئی اور ہمارے ہاں چمن میں جھولا پڑا، مامائیں اصیلیں، لونڈیاں باندیاں، انائیں دوائیں، محلے والیاں، آئیاں، گیئیاں، غرض سب ہی دن بھر ننگی رہتی تھیں اور گلے پھاڑا کرتی تھیں۔ یاں کبھی دل میں بھی امنگ اٹھتی تو ابا جان کے ڈر کے مارے منھ سے بھاپ نہ نکال سکتے۔ کیوں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ قلعے کا کھوجڑا انھیں ٹھنگو سے گیا۔ یوں ہی سارے بادشاہزادے تباہ ہوئے۔ کہ رات دن سوائے تاتا تھئی، تاتا تھئی کے اور کچھ کار ہی نہ تھا۔ اور جہاں اس کا شوق پڑا اور پڑھا۔ یہ تو اگلے لوگوں کے خیال اور اس وقت کی حالت ہے جب کہ تباہی سروں پر منڈلا رہی تھی اور برے دن آنے کو تھے۔ نہیں پہلے کیا راگ رنگ میں بھنگ تھوڑی

گھلتی تھی۔ ہر کام خوبصورتی، اعتدال اور عقلمندی سے کیا جائے تو ہنر معلوم نے لگتا ہے۔ اور نہیں تو بے ڈھنگے، سڑبلے، بلّلے پن کا ہنر بھی عیب ہو جاتا ہے۔ غرض اُن کے اصرار اور ہر وقت کی صحبت سے مجھے بھی اس کی طرف مائل ہونا پڑا۔ سارے اُن کے دوست ولایت کے واپس شدہ ہیں یا دلّی والے سیّد کے دانش گاہ کے بی اے، ایم اے ہیں۔ اکثر اپنی اپنی بیویوں کو بھی لاتے ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی اُن بیویوں سے ملنے جو چلی جاتی ہوں تو مارے خاطر کے بچھ جاتی ہیں۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ ہم شہر والیوں کے تو نام ہی نام ہیں یہ وہ خاطر کرتی ہیں کہ مجھ سے تو خاک رزمہ برابر بھی نہ ہو۔ بس یہاں جو کچھ ہے دانش گاہ ہی ہے۔ یہاں لوگوں سے ملنے جلنے میں اکثر دلّی پیاری کا مزہ آجاتا ہے۔ دلّی والے ہیں بھی یہاں خاصے اور لکھنؤ یا اس کے سواد کے جو ہیں اُن کے محاورے اور خاص خاص اصطلاحیں تو ذرا ہم سے اجنبی ہیں لیکن یہاں کی آب و ہوا کا کچھ ایسا اثر ہے کہ وہ دھڑ ٹوٹا گھسٹتا اور اپنی جان کو پٹختا ہوا لہجہ باقی نہیں رہتا بلکہ جڑ جڑا کر خاصہ درست ہو جاتا ہے۔ اے کھوگی اچھے جھگڑے میں ڈالا سید حسین صاحب کی سج دھج ناک نقشہ بتایا جا رہا تھا یا لگیں اپنے اور اُن کے گھر اور روزمرّہ کے اوقات وغیرہ بتانے۔

لو سنو۔ گلابی گلابی ہونٹوں اور صفا صفا گورے گورے کلّوں پر منڈی اور خوب گھٹی ہوئی داڑھی مونچھ کی کلونس لیئے سبزی کی مغزی ایسی پیاری اور بھلی معلوم ہوتی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ دورانِ تقریر میں ہنستے یا مسکراتے تھے تو معلوم ہوتا

تھا کہ سمندر میں موتیوں کی چھال ہے یا ذہن میں نورانی لہر آگئی ہے۔ سیاہ انگریزی لباس
لاکھ بناؤ دیتا تھا۔ اور آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ لمبی تیلی گردن میں سفید چمکتا ہوا
خوب کلف دار اکہرا سخت پٹھا ٹھوڑی کے نیچے سے گوشے مڑے ہوئے جس پہ
کالی گل بھوج بندھی ہوئی ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی جیسے کالی تیتری دونوں پر
پھیلائے سیوتی کی کلی پر بیٹھی ہو۔ قمیص کے سفید سخت سخت کف کالے نیم تنے کی
آستینوں سے نکلے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کالی کالی گھٹا کے
آخر سرے پر ایکا ایکی بجلی کی ایک پتلی سی لکیر چمک کر رہ جائے۔ کالے بالوں
اور سیاہ لباس میں چہرہ ایسا دمکتا تھا جیسے خوب گھرے ہوئے گھرے گھرے
بادلوں میں رات کو چودھویں کا چاند آجائے اور پھر چلتے ہوئے بادلوں میں دفعتاً
نمودار ہو کر منتظر نگاہوں کو چندھیا دے۔ مگر ساتھ ہی اپنی ٹھنڈی اور خنک روشنی
سے ٹھنڈک بھی پہنچائے۔ تقریراً انگریزی میں تھی جو انھوں نے بڑی خوبی سے
ادا کی اور ہاں ہماری مجلس اتحادیہ کے نائب میر مجلس نے بھی مہمانوں کا جام صحت
پیش کیا۔ اِن کی ہیئت سنو، خوب بھاری ڈیل۔ لمبا قد۔ اللہ جھوٹ نہ بلائے تو
کوئی پانچ ہاتھ کا ہوگا یہ لم تڑنگ، لحیم شحیم موٹا تازہ مرد وا خوب سُرخ و سفید میدا
شہاب سی رنگت، کھڑی کھڑی ناک رُخ سے تو کھڑی کھڑی معلوم ہوتی ہے مگر
میری ایک سہیلی جو بہیں کی ہیں کہتی ہیں کہ نہیں ناک تو کھڑی خاک نہیں بیچ کی
راس کی ہے تو میرا بھی یہ مطلب نہیں کہ ناک کاغذ ہی کی کٹی ہوئی لگی ہو یا ہو تو نگوڑی

بندی خانے کی دیوار، موزوں ہو اور چہرہ پر بھلی معلوم ہوتی ہو۔ ظم چھوٹی آنکھیں
چوڑی کشادہ چمکتی ہوئی پیشانی۔ کچھ گول ٹیوا سا چہرہ، داڑھی منڈی ہوئی۔
مونچھیں ذرا بھوری ولائتیوں کی سی خوب برابر برابر دانت جمے ہوئے جیسے
سنگلدیپی موتیوں کی گتھی ہوئی لڑی۔ موٹے موٹے گبدے گبدے گورے
بھبوکا سے ہاتھ، سر پہ سُرخ تربوش پھا گلیپوری ریشم کا گہرے ملائی رنگ کا
ترکی تنا زیب تن جس میں سیپ کے چپک دار سنہری کنارے منڈھے ٹکے لگے تھے
وہی پیچھا چرا جیب دار تنا جس کا خاکہ دلّی والیاں اُڑاتی ہیں۔ وہ ولی سید کے
مدرسے کے لڑکے تو نگوڑے خاصے مداری ہو جاتے ہیں کہ پیچھے ہاتھ لے گئے
اور مداری کے ٹوکری کی طرح کبھی ہاتھ ڈال جھٹ رومال نکالا۔ کبھی سرمہ کی
قلم، کبھی چار پائی کی دعوت میں سے اُڑایا ہوا زنگترہ، غرض دنیا بھر کی چیزیں ہیں
کہ نکلی چلی آتی ہیں۔ نگوڑی جیبیں کیا ہوئیں عمرو عیار کی زنبیل ہو گئی۔ ان کی
تقریر خاصی رہی۔

ہائے ہائے اے ہے
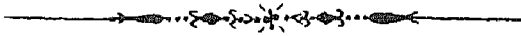
ماہرخ پیاری میں تیرے واری!

کہتی تو ہو گی کہ کانوں میں ٹینٹیاں اڑا کر بیٹھ گئی یا منہ میں گھنگنیاں بھر لیں۔ تیزولیں کا چاند دیکھو اور اب میرا نجی کا مہینہ آ لگا۔ لیکن مجھے خط نہ لکھنا تھا پر نہ لکھا۔ سب دنوں کی کسر اب نکال دونگی۔ ذری ذری سی بات کا حال لکھونگی مگر ہو گا کیا؟ نگوڑے اسی تھنکارے جنگی بخار کا رونا۔ نت نئے دکھڑے۔ شہر کی ہل چل ایک ایک کی آپا دھاپی، نفسا نفسی، چاروں طرف کی ہائے ہائے۔ اے ہے اللہ دشمن کو بھی وہ سماں نہ دکھائیو۔ اب خیال سے لرز جاتی ہوں۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ کوئی کسی کو نہ پوچھتا کہ ارے تمھارے پر کیا گزرتی ہے۔ کیا بپتا پڑی ہے۔ تمھارے منہ میں کے دانت ہیں۔ ادھر سے رونے کی آواز ادھر سے ہائے کی صدا، پچھواڑے سے دھڑا دھڑ بپتا پیٹا۔ کلیجہ تھا کہ پھٹا جاتا تھا دل تھا کہ نکلا جاتا تھا۔ مجھ کرموں بندی کو دھڑکن کا مرض۔ پہلے ہی کی خفقانی دیوانی چاروں طرف کی سن سن کے سن ہوئی جاتی تھی۔ دشمنوں کی جان نکلی جاتی تھی الٰہی اپنے پرائے پیاروں کی خیر۔ الٰہی کل کی ماماٹھنڈی۔ جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ اور کبھی یا رحیم رحم کر یا کریم کرم کر آئی بلا کو دفع کر کل کی کڑی

کو نرم کر۔ کی تسبیاں (تسبیحیاں) پڑھتے پڑھتے انگلیوں میں چھالے پڑ گئے۔
یا علی یا علی فاطمہ حسن حسین دم کرتے کرتے ہونٹ پپڑا گئے۔ لی خمسۃ اطفے
بھا حر الوباء الحاطمہ المصطفٰے والمرتضٰی وابناھما والفاطمہ کے حصّا
پڑھ پڑھ کر چاروں طرف باندھتی۔ گھڑی بھر شام گئے سے اذانوں کی آواز گلی
گلی گھر گھر سے آتی۔ نام اللہ کا کیسا پیارا نام۔ لیکن جوں جوں اذانوں کی زیادتی
ہوتی ویوں ووں بیماری کا زور بڑہتا جاتی دکھ ہی میں اللہ میاں یاد آتے ہیں۔
نہ بھلا کون اب پوچھے۔ وہی اعمالوں اور اپنے کرتوتوں کا نتیجہ۔ نیت گیل برکت،
خوب بھگتی اور اچھی بھگتی اور اب ٹھوکر کھا کے بھی نہ سنبھلیں تو رحمت خدا کی۔ دنیا بھر
میں چلا چلی کا بازار گرم تھا۔ ادھر فرنگیوں میں ایک کو ایک مارے ڈالتا تھا۔ جنے
کتنے اللہ کے بندوں کا خون ہوا ہوگا۔ ادھر ایک طرف نگوڑا کال، ہر چیز کا توڑا،
دوسری طرف بیماری چینڈوں اور قرضوں کی مار، کم بخت پیٹ کو روئیں یا جانوں
کو۔ اپلوں تک کو بھاگ، ذری سی گھاس چھ چھ آنے اور آدمی کا بچّہ ایسا
علّت ارزاں کہ کوئی کوڑی کو نہ پوچھے۔ ہاں وقت پہ گھس لگانے کو نہ ملے، لڑائی
کا دروازہ کھلا اندھے، لولے، لنگڑے، نکمے احدی سب کی بھرتی۔ اماں جان تو
اللہ والیوں کو لگائے ہی رہتی ہیں روز ان کا جھمگٹا، شہر بھر کی خاک چھان کے
آتیں اور ایسی ایسی خبریں سناتیں کہ میں تو اگر مارے ہولوں کے اٹھنا بھی چاہتی
تو معلوم ہوتا کہ زمین نے پاؤں پکڑ لیے۔ شل ہو کر رہ جاتی۔ بیٹھی بیٹھی منہ تکا کرتی۔

اور ہاتھ پیر ٹھنڈے پالا ہو کے رہ جاتے ہیں۔ دھڑکن کا یہ حال ہوتا کہ کلیجہ اچھل کے منھ کے رستے باہر نکل پڑیگا۔ کوئی کہتی بلا لوں واری جاؤں انجانتیوں کو جاڑا بھی بھرا تی ہوں۔ تین تین دن کے کڑاکے گزر جاتے ہیں۔ کل صبح سے کھیل بھی اُڑ کر گئی ہو تو بری بسبت ہی۔ سرکار آٹے کہاں سے، کام کا مندہ، ہر چیز پہ آگ، اس دوزخ میں پانچ سیر کا گھی سوا من کا آٹا گیا ہی۔ اب گھی تو خواب ہوا۔ رہا آٹا وہ بھی روپے کا پان سیر کپڑے پہ جدا خدا کی مار۔ پیٹ بھریں کہ تن ڈھکیں، روئی باپ کے مول چھ برس کا پرانا بالا پوش، وہ بھی ایک اور بندے چھ۔ روئی کے پوٹلے اڑ گئے جھلنگا گدڑی کا گودڑ ہو کے رہ گیا۔ ارادہ تھا کہ سستی ہو گی اُدھیڑ کے کچھ اسے تو ملک کر ٹھیک کرونگی، کچھ نئی ڈلواؤنگی۔ میاں نہ ذرا ثابت ہی استر میں جان نہیں رہی، اسے لگا لونگی۔ جاڑے کٹ ہی جائینگے۔ آئندہ کس راجہ کا راج کون جیے کون مرے۔ بھلا چار چھٹانک گالے کی روئی۔ سیر بھر کو چار روپئے چاہئیں۔ کس گھر سے لاؤں وہ تو یوں کہو کہ اب کے وہ جاڑا ہی نہ پڑا کہ برف کٹتی تھی! اور دانتا سے دانت بجتا۔ لیکن سُرسُری نئی خشکی، معلوم نہیں ہوتی۔ بس تیر کی طرح سینے میں کلیجے میں گھسی جاتی ہی۔ کمیٹی کا وہ دیوالہ نکلا ہی کہ اب نہ لحاف ہی نہ کمّل، بلیہ بھر روئی نہیں کہ سینہ گرم کریں۔ بڑے میاں، میری سمدھن، لڑکا اور بچی پرسوں سے ایسے پچھڑے ہیں کہ نہ منھ سے بولیں نہ سر سے کھیلیں۔ اللہ اپنا رحم کرے۔ آدھی جان رہ گئی ہی۔ ایک میرا اکیلا دم۔ کہاں سے دوائی لاؤں اور کہاں سے پیٹ کی آگ

بجھاؤں۔ محلّے سے قرض مام (دام) کر کے لے آئی بھی تو بیوی کب تک اور
کوئی دے بھی تو کہاں تک۔ پوری اللہ ہی کے ڈالے پڑے۔ ہر ایک اپنے حال
میں گرفتار ہے۔ کوئی کہاں تک کسی کی بھرن بھرے عام طور پر یہ حال ہے کہ کماؤ
ایک کھانے والے دس جنے۔ ولایت کا مال آنا بند ہوا تھا۔ چاہو کہ کارخانوں
کو فراغ ہو یہ ناممکن کرخن دار (کارخانہ دار) الگ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے
ہیں، شاگرد الگ۔ شریف کی مرن ہے۔ کس کے آگے بیوی میری روئیں۔
ایک وہ زمانہ تھا کہ اسی فقیرنی کے گھر میں چار چار ماما اصیلیں اور پیش خدمتیں تھیں۔
اب بیمار بھی پڑو تو ٹھنڈائی خود ہی رگڑو تو حلق میں پڑے۔ اللہ اپنا رحم کرے
دن پھرینگے اب کیا خاک، گھٹتی ہی کا پہرا ہے۔ کسی کے آگے کہتے بھی تو حیا آتی
ہے۔ اماں جان نے ٹھنڈا سانس لیا۔ خوانچہ اُٹھا پورا اپنا چپکے سے حوالہ کیا
وہ مٹھی گرم کر کے سدھاریں بھابھی جان مُسکرائیں۔ کہیں اُنھوں نے دیکھ لیا۔
تیوری پہ بل ڈال کے خفا ہوئیں۔ بیٹی خوفِ خدا کر اللہ سے ڈر۔ کیا پتھر کے دل
ہیں۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے۔ نگوڑی چار اے بی سی ڈی کی کتبیاں چیل کوّے چوہے
بلّیاں کیا پڑھ لیں۔ بس روشن خیال بن گئیں۔ کسی کی حاجت روائی کو کمینہ پن
اور اینڈل پنا پھیلانے پہ محمول کیا۔ دس درجہ یہاں ستّر درجہ آخرت کے عقیدہ
کو مولوی ملاؤں کے لوٹنے کمانے کا ہتھکنڈا سمجھ لیا۔ ہمدردی کو بزدلی جانا
دل سوزی کو بیکاری کا شغل سمجھا۔ آخرت کی جزا سزا کو مذہبی ڈھکوسلا بتلایا

آگ لگے ایسی تعلیم کو اور بھاڑ میں جائے ایسی روشن خیالی، یا وا آدم ہی نرالا ہو گیا۔ کہ آدمی کے بچے بنتے بنتے لگے بندر کی اولاد بننے۔ وہ جواب تو کیا خاک دیتیں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئیں۔ لیکن فائدہ یہ ہوا کہ خون کی جلد جلد گردش سے ذرا گرمائیں اور اُٹھنے کی طاقت آئی۔ اپنی طرف صلابت کو بچے والی سہ دری میں چلی گئیں۔ کھانے کی بلاؤ ہوئی تو آئیں۔ یہاں بھی اپنی طبیعت کے خلاف سٹر کوؤں کی سبھا جمی دیکھی۔ آن بیٹھیں اور چپکے چپکے مٹر مٹر بیٹھی سب کی سنا کیں۔ بیری والی ہمسائی کے ہاں ایک چھالیا کترنے والی آتی تھی۔ اس دن وہ بھی ادھر کہیں سے آنکلی۔ لمبا بانس کا سرا نیچا قد۔ کوئی ساٹھ سے اوپر ہی اوپر عمر۔ سوکھی الفن۔ کمر سیدھی جیسے تیر۔ گدّی کا ٹھڈّا، کھال ہڈیوں کو چمٹ کر رہ گئی۔ چہرے پہ جھرّیاں۔ کھریا کی چنّٹ، ناک کا بانسہ ہونٹ کو چومے۔ ذرا جھینگی سی، کانوں میں کندلے کی ایک ایک بالی جس میں دو تین دن کے سوکھے پھول پڑے کالے حاشئے کا جیبوری انگوچھا اوڑھے کھٹّا بکل عجیب بڈھنگے پن سے مارے۔ سیدھا پجاما پہنے جس کی موریاں ایڑیوں میں ٹڑیں۔ گول پنجے کی لال نری کی جوتی پاؤں میں۔ ایک اَنگا سا کرتا گلے میں ہاتھ میں چھالیا کا کتّا اور بڑا رامپوری سروتا لئے عجیب دھج کی عورت آن سلام کر بیٹھ گئی۔ کتنا کھول چھالیا کٹر کٹر کترنی شروع کی۔ امّاں جان نے اپنی حسب عادت اُس سے بھی بات چیت شروع کی اور بھابھی جان جز بز ہوئیں۔ بسم اللہ گوٹے والی نے سنانا شروع کیا کہ امکام گیا۔ ڈھمکا گزر گیا۔

کل تو سرکار چھ سو کی تعداد تھی۔ مارا رتھیوں اور جنازوں کے رستہ بند ہو گیا سڑک پر ادھر سے اُدھر جانا دوبھر ہو گیا۔ میں نے تو کل سے کان امیٹھا جواب باہر نکلوں۔ نہ سرکار باہر نکلینگے۔ اسکی اُس کی سُن سُن کے اور دیکھ دیکھ کے اپنا آدھا کام تمام یونہی کرینگے۔ دیکھئے بیوی کیا ہونا ہے۔ اے ہے کہیں قیامت تو نہیں آئیگی۔ آئے تو کوئی تعجب نہیں۔ تیرھویں صدی میں ہونے کی جانوروں نے پناہ مانگی ہے اور یہ تو چودھویں ہے جس کا کوئی آگے حال ہی نہیں۔ دم بھر میں اچھا بھلا چٹ پٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔ میری ہمسائی کا کوئی تین برس کا بچہ کھیلتے کھیلتے ہاتھوں ہاتھو میں سے نکل گیا۔ ننا نا ایسا گُل گوتھنا سا تھا۔ ایسی ایسی دماغ سے باتیں اتارتا کہ اَن ہوئے کو پیار آئے۔ اے ہے نظر کھا گئی، بس کوئی ایک ہی دن میں تو فیصلہ ہو گیا۔ جیسے کبھی تھا ہی نہیں کوک چلی میّا برہا کی آنچ میں پڑی کو کتی تھی کہ آئے گئے کا کلیجہ پھٹتا تھا۔ اے کوئی دو تین دن اسے ہٹے ہونگے کہ پے در پے تڑا تڑ تین کڑاکے کی اور موتیں ہوئیں۔ جوان کڑیل کھاتا کماتا بیلوٹھی کا بیٹا۔ آنکھیں کیا نیبو کٹے رکھے ہوئے باہر سے آیا۔ آتے ہی پانی پیا۔ کہا کہ آج تو اس بندے کے کچھ گلے اور سینے میں خراش سی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد کھانسی کا ٹھسکا شروع ہوا۔ کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا کھٹکا کھٹکا سا ہو۔ عشا تک تو ہل ہلا کے وہ بخار چڑھا کہ روٹیاں اتار لو۔ آدھی رات گئے سے گھرّا لگنا شروع ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے کچھ بھی نہ تھا یہاں میرے ہاں ساس بیچاری تبرک وہ مسدہا رہیں۔ برابر کے گھر میں میری

مکان داری کی جان جوان ہو کوئی برس دن بھی تو شادی کو نہ ہوا ہو گا۔ ابھی تو نگوڑی دلھن بننے کی خوشبو بھی نہ گئی تھی۔ وہ اللہ کی پیاری ہوئی۔ غرض جدھر دیکھو یہی تو ائی آئی۔ سرکار اب مل رہے ہیں کل کا بھروسہ نہیں لیکن چاہو کہ اب بھی لوگ سنبھلیں یہ ناممکن۔ ایمان داری۔ بھلمنسائی۔ کھرا پن۔ آپس داری۔ پیت محبت سلوک سب کا خاتمہ۔ ایک کو ایک ہے کہ کھائے جاتا ہے۔ جو دم گزرے اُسے غنیمت نہیں جانتے۔ یہ نہیں دیکھتے زمانہ کیسا جا رہا ہے۔ عبرت پکڑیں یہ ناممکن۔ اللہ رسول سب کو بھول گئے! اور تو اور موت سے نہیں ڈرتے۔ نگوڑے کیا دل ہیں۔ مُردوں یہ آوازے کستے ہیں کہ خدائی بلندے جا رہے ہیں۔ اے اللہ توبہ۔ مردے بکتے ہیں کہ جب کسی کو رکھوانے جاتے ہیں تو ساٹھ ساٹھ چارپائیاں دھری ہوتی ہیں۔ گورکند کھودتے کھودتے عاجز آ گئے۔ اللہ بھلا کرے ان طالب علموں کا انھوں نے بڑی مدد دے رکھی ہے۔ قبرستانوں میں یہ کام کریں، محلوں میں گھر گھر پوچھتے پھرتے ہیں۔ غسل کرانے میں یہ ہاتھ بٹائیں۔ ادھر بیگم پنجابیوں نے کفن کی دوکانیں مفت کھلوا دیں۔ جو چاہے لیجائے۔ بھلا معمولی سا کفن بیس پچیس کا آتا ہے۔ کوئی کہاں سے دے۔ کس گھر سے لائے۔ یا الٰہی بھلا کرے حکیم محمود خاں کے گھرانے کا کہ گھر گھر پوچھتے پھرتے ہیں کہ ارے کوئی بیمار تو نہیں اور مفت دوائیں تو کیا غذا تک کے دام دے جاتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے بھی دوائیاں مفت ملتی ہیں۔ ہر ناکے پر چوراہے پر تراہے اور موڑ پر جوشاندے کی دیگیں چڑھی ہیں

بالٹیاں بھر بھر کے لیئے پھرتے ہیں اور بیماروں کو پلاتے پھرتے ہیں۔ کیا کریں اپنی
سے تو سب جتن کر ڈالے۔ لیکن چاہیو کہ بیماری کا زور کم ہو۔ یہ نظر نہیں آتا۔ اب
تو بیگم جگہ جگہ اللہ کا نام لیا جا رہا ہے۔ غریبوں کو مفت کھانا اور کپڑے تقسیم ہو رہے
ہیں۔ جڑا دل میں جڑا دل۔ مندرس میں مندرس۔ غرض جس چیز کا جس کو حاجتمند
دیکھتے ہیں اللہ راہ دیتے ہیں۔ اے کبھی تو اللہ میاں کو رحم آئے ہی گا۔ سرکار!
چاروں طرف موت کا بازار گرم ہے۔ ایک بھاڑ ہے کہ تڑا بھن رہا ہے۔ یہ جانے اور
کیا کیا خبریں سنا کے مجھے ہولاتی کہ اتنے میں چھالیا والی بڑی بی بولیں کہ سرکار!
دیوار بیچ رمضو نام ایک منہار رہتا تھا وہ ذکر سنا رہا تھا کہ ایک دن کوئی جھٹ پٹے
کے وقت راجہ کے بازار سے وہ لپکا لپکا شہر آ رہا تھا کہ رستے میں ایک عورت کوئی
اسّی پاٹ کا گھومدار لہنگا پہنے، لال چندری اوڑھے گھونگھٹ نکالے چلی جا رہی
تھی منہار کو دیکھ بولی کہ مجھے چوڑیاں پہنا دے۔ وہ نانا خوشی خوشی رستے سے
ایک طرف ہٹ اُسے پہنانے بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اس نے پہنانی
شروع کیں۔ غرض دونوں ہاتھوں میں اس نے ریشمین چوڑیاں پسند کر کے پہن
لیں۔ اور جب دونوں ہاتھ اچھی طرح بھر گئے اور چوڑیاں رہ گئیں تھوڑی تو
اُس عورت نے ایک تیسرا ہاتھ اور دوپٹے میں سے نکالا اور کہا کہ اس میں بھی
پہنادے۔ منہار نگوڑا کانپ گیا۔ لرزتے ہاتھوں باقی کی چوڑیاں تیسرے ہاتھ
میں پہنا دیں۔ جب چوڑیاں ختم ہوگئیں اور ساری ٹوکری ہوگئی خالی تو اس

عورت نے ایک چوتھا ہاتھ نکال کے کہا کہ لے دیکھ یہ تو خالی ہی رہ گیا۔ منہار ننھے کا دم تو پہلے ہی سوکھ چکا تھا۔ اب تو رہا سہا اور بھی فیصلہ ہو گیا۔ ہمت کر کے بولا۔ کہ مائی تو کون ہے؟ اس نے مسکرا کر کہا۔ ہوں کون میں سارستی ہوں۔ یہ ریشمی چوڑیاں مجھے دل سے بھائی ہیں اور اب یہ سب میری ہو چکیں۔ تو کہہ دیجیو کہ اب اگر کوئی بھی عورت یہ چوڑیاں پہنے گی تو یا تو تختے پر اتروا دونگی یا بڑی بوڑھی کے ہاتھوں ان کو تڑوا دونگی اور اس کام کے لیئے میرا ایک بھائی بخار ہے وہ آئیگا۔ تو سب کو خبردار کر دیجیو۔ یہ کہہ سرکار وہ غائب ہو گئی۔ رمضو کو مارے ہول کے وہ ہل ہلا کے بخار چڑھا کہ تیسرے دن آنکھ کھولی۔ میں نے جو یہ چھا لیا والی بڑی بی سے سنا کانپ گئی۔ میں بھی لاجوردی ریشمین لچھا پہنے تھی اور جو جو پہنے تھیں سب نے اسی وقت بڑھا دیا۔ میرے پاس کالی کریلیاں نخیں رکھی تھیں وہ اسی وقت پہن لیں۔ مگر دل یہ کچھ ایسا دھا کا بیٹھا کہ اسی وقت سے بتاشے کی طرح بیٹھتا معلوم ہونے لگا۔ رات ہوئی وہی اذانوں کا شور شروع ہوا۔ کوئی گیارہ بجے رات تک اذانیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد سناٹا۔ جو رہ رہ کے چاروں طرف کے کھانسی کے ٹھسکوں اور ڈھوں ڈھوں سے ٹوٹتا تھا۔ نیند نہ جانے کیسی آنکھیں ترس گئیں بند کر لیتی تو ایسے برے برے سماں بندھتے کہ گھبرا کر کھول لیتی۔ قلب کی عجیب کیفیت، غرض ساری رات قسم کھانے کو آنکھ نہ لگی۔ صبح جو اٹھی تو دماغ بالکل گنگ، جی بھاری بھاری۔ اور ایک وحشت و

طاری، اور نگوڑی خواہ مخواہ کی۔ ناشتہ زہر مار کیا تو وہ بھی کچھ کڑوا کڑوا سا لگا، اور گھبرائی کہ الٰہی خیر کیجیو۔ اب سیدھی آنکھ پھڑکی۔ اُسی وقت فال گوش کی مانی۔ کہ باہر سے کسی اللہ والے نے صدا دی۔ کیا تھا کیا ہو گیا۔ اُسی وقت ماتھا ٹھنکا۔ کہ الٰہی خیر ہی ہو۔ اور ہاں رات بھر کان میں کھجلی رہی مگر میں نے ڈر کے مارے نہ کھجایا۔ تھتکارتی رہی! اور درود شریف پڑھ پڑھ کے دم کرتی رہی یونہی ناشتہ کرکے بیٹھی تھی باہر سے ڈاک آئی۔ معاً دل نے کہا کہ سناؤنی آئی میں نے لاحول پڑھی اور دل پہ کی لعنت۔ میرے نام کا خط تھا کھولا تو کونہ پھٹا۔ بس زمین سرسن سے نکل گئی۔ . . . .

(تنقید)

میری چندا درخشندہ، تو جئے، راج رچے، دُنیا کے سُکھ چین دیکھے، کبھی
تو ہو گی کہ یہ اللہ ماری بہن منہ دیکھے کی محبت کرنے والی ہے۔ آنکھیں ہوئیں چار
دل میں آیا پیار۔ اور بہن کی ساری چاہت اوپری پھپھڑ دلالے ہیں۔ بہنیں میری
جان، میں تجھے بھول سکتی ہوں۔ نگوڑے گھر کے دھندے اور آئے دن کے جھگڑے
میری تو جان کو وبال ہو گئے۔ بچوں میں گرفتار رہی۔ ان کی مزاجداری۔ ہر
بات کے رکھ رکھاؤ نے میری تو زندگی بے حلاوت کر دی۔ ایسی زیست سے
بیزار ہوں، دلی پیاری کی یاد اور تم سب کی جُدائی۔ مجھے ہر وقت کھائے جاتی
ہے۔ بہتیرا گھر بار کے جھگڑوں میں دل ڈال کے تمھیں بھلانا چاہتی ہوں لیکن
یہ ناممکن۔ کوئی رات ایسی نہیں جاتی کہ مجھے اپنی بیری اور کھرنی خواب میں
نہ دکھائی دیتی ہو۔ آج تم سب کو خواب میں دیکھا اور میں نمانی یہی سمجھتی رہی کہ
بیچ بیچ تم سب میں گھری بیٹھی ہوں۔ آنکھ کھلی تو بہت بُرا معلوم ہوا۔ چپکی لیٹی تھی
کہ صبح ہی صبح سشیدو دوڑی آئی کہ سرکار دانش گاہ میں کوئی رشید احمد صدیقی

ہیں اُنھوں نے ایک اُستانی بھجوائی ہے۔ میں نے کہا دُر گور نگوڑی۔ میں کیا جانوں کون
رشید احمد۔ میں اس نام سے واحد شاہد بھی نہیں۔ نہ ہمارا ان سے ملنا جلنا۔
جا ڈھنگ سے پوچھ کے آ کہ کون بیوی ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں۔ کیوں آئی ہیں۔
کیا کام ہے؟ وہ اُلٹے قدموں لپکی ہوئی گئی۔ آن کہا کہ سُلطان جی سے آئی
ہیں۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ کوئی صاحبزادی ہونگی۔ سلطان جی کا نام سنتے ہی
جی تڑپ گیا۔ خود بلبلا کے اُٹھی کہ جا لو لاؤں کہ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ
ایک بیوی باریک حباب سا لالن جھجھاتا گلناری دوپٹہ اوڑھے، لپیٹے ڈیوڑھی
سے انگنائی میں آتی معلوم ہوئیں۔ میں دیوانی اُستانی کے نام سے سمجھی تھی
کہ کوئی عمر رسیدہ بڑی بوڑھی بیوی ہونگی جونہی اُنھیں جھجھاتی چوندری میں
اپنے تئیں چراتے چھپاتے میں نے آتے دیکھا۔ فوراً بد دل ہو بدگمان ہو گئی۔
کہ اچھی یہ کون خیلا باولی بیوی نو بہار ہیں۔ بڈھی گھوڑی لال لگام۔ گھر آئے
کی آدر سبھی کرتے ہیں۔ لیکن اپنی بے رُخائی چھپا نہ سکی وہ بچاری بھی کچھ
سٹ پٹا سی گئیں۔ چپ چاپ دالان میں بیٹھ گئیں قمرن۔ تو تم جانتی ہی ہو۔
ہے آفت کی پڑیا۔ اس بلا ناگہانی نے نیچے کی صحنچی میں سے ڈھولک پر
گانا شروع کیا "مجھے بڑھیا نہ کہیو کوئی میں نے جوانوں کی عقل کھوئی۔ بڑھیا
مسی لگائے مکھ کیسا جیسے جالی میں بندر بیٹھا" تم جانتی ہو مجھے اس کی باتیں زہر
معلوم ہوتی ہیں اور خواہ مخواہ میرے گھر کا نام نکلتا ہے۔ میں نے مغلانی جی کو

اشارہ کیا۔ وہ بارے سمجھ گئیں اور بہانہ بنا اُٹھ جا اُسے منع کر آئیں۔ میں نے
اپنی خفت مٹانے کو بات شروع کی۔ کہ آپ کہاں سے آئی ہیں۔ کیسے
کرم فرمایا۔ جواب دیا کہ خواجہ بانو صاحبہ کے ہاں سے آئی ہوں۔ بہن لیلےٰ کا
نام سن میں بھڑک گئی۔ ان کے ہاں کی خیر صلا پوچھی۔ حور بانو کی شادی کے
متعلق دریافت کیا۔ اور میں نے کہا کہ اچھی یہ کیا بات ہے کہ سارے شہر میں تھڑی
تھڑی ہوئی ہے کہ حضرت صاحب نے بیٹی کو اپنی حیثیت کے لائق کچھ نہ دیا۔ اُستانی
میری ساری باتیں بیٹھی سنتی رہی۔ اور مٹر مٹر دیکھا کیں۔ پھر بڑے بھاری گھمبر
سینے سے جواب دیا۔ کہ بیگم صاحب لونڈی کی خطا معاف۔ جو بیٹی کو حضرت صاحب
نے دیا وہ کیا کوئی لکھ پتی بھی دیگا۔ دنیا اس کا نام ہیں کہ بیٹی کو نادیہ بیل بنا
کاٹھ کباڑ ننگوڑا دیمک کا کھاجا لاد، گھر سے نکال رخصت کیا۔ اور بیگم پھر جس
نے بیٹی سی شے دیدی اس نے کیا اُٹھا رکھا۔ اور رکھو دنیا کے کہنے سننے کو
تو بیاری میری خلق کا حلق کسی نے تھوڑی پکڑا ہے۔ مغلانی ہٹ سے بیچ میں
بول پڑیں کہ ہاں سر سر استانی جی کی بات باون تولہ باون رتی کی۔ نواب
مینڈو خاں نے اپنی بیٹی رحنا بیگم کے دان دہیز میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی
تھی۔ حتےٰ کہ گھوڑوں کے لیئے سونے چاندی کی میخیں تک دے دی تھیں۔
لیکن ایک پوربیا سائیس گالی دیکر بولا۔ کہ نواب نے کیا دیا۔ میخ جوتک
تو دیئے ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ بی استانی آخر انھوں نے کیا کیا دیا

اُستانی جی نے کہا کہ بیگم! کیا کیا تو رہنے دیجئے۔ بیٹی داماد کو جو اُنھوں نے چیزیں دیں ہیں وہ وہ انمول موتی ہیں کہ جن کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ دنیا کا کاٹھ کباڑ گڑ گوڈر گہنا پاتا ایک طرف اور یہ بے بہا رتن ایک طرف۔ بیگم! کپڑے لتّے، گہنے پاتے کو چور لے جائے۔ کاٹھ کباڑ کو گھن لگے دیمک کھائے۔ لیکن یہ چیز جو اُنھوں نے بیٹی کو جہیز اور داماد کو سلامی میں دی۔ یہ ایسی چیز ہے کہ چرائے نہ چوری جائے۔ اور جتنی برتو اُتنی برکت۔ اپنے پرائے یگانے بیگانے پاس پڑوس۔ دُور نزدیک آئے گئے۔ سب خرچیں۔ اس میں ٹوٹا نہ آئے۔ مزا یہ کہ جتنی اُٹھاؤ اُتنی زیادہ اور نفع سب کو برابر۔ بیگم! کپڑا جس کے تن کا ہوتا ہے وہی خوب سے پہن سکتا ہے۔ اُسی کو زیب بھی دیتا ہے۔ ہزار گلے کا جوڑا بھی دس بیس برس میں پہنو تو بور بور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ لباس ہے کہ نہ گھسے نہ پھٹے اور پھر کوئی صاحب نصیب بچی اپنے باپ کے دوستوں سے برات کھول یا شادی کا تحفہ اگر لے گئی ہے تو ہرگز ہرگز کسی حالت میں اس سے زیادہ نہ تھا۔ جو جور بانو کے باواجان کے دوست حضرت اکبر نے اپنی اس بھتیجی کو دیا۔ یہ سُنتے سُنتے میرا اشتیاق حد سے گزر گیا۔ بیقرار ہو بولی کہ اچھی میری اُستانی! وہ دونوں کیا چیزیں تھیں۔ بولیں کہ بیگم! حضرت خواجہ حسن نظامی کی بیٹی داماد کو نصیحت اور حضرت اکبر الہ آبادی کی ناصحانہ نظم۔ میں تو اتنی تعریفوں کے بعد یہ سن کر بجھ سی گئی۔ لیکن بی مغلانی تڑخ کر بولیں کہ کوئی ان میں ایسے لن کے سے

رتن جڑے تھے اور لال ٹانک رہے تھے۔ استانی جی ذرا سنبھل کر بیٹھیں اور حضرت
صاحب کی بیٹی، داماد کو نصیحت دوہرائی۔ اوّل سے آخر تک بیوی اُن کو ازبر
یاد تھی۔ میں تو بیٹھی منہ تکتی کی تکتی رہ گئی۔ اور اپنے ایمان کی قسم بالکل اسی انداز
اور اُنھیں الفاظ میں بیان کی۔ دیکھا اَمّتُ کہیے کہ حضرت صاحب ہیں۔ ایسا
سماں باندھا کہ حضرت صاحب کی ساری پیاری صورت میری آنکھوں تلے پھر گئی
وہ چھریرا چھریرا ڈیل، لمبا قد، تیکھا تیکھا نقشہ، محنت و ریاضت و نفس کشی سے
زرد رنگ جیسے سون جوہی کی پنکھڑی۔ چہرے پر جیسا جوں نور برستا ہوا،
کالی کالی کلیں دونوں طرف بل کھاتی ہوئی۔ حضرت امیر خسرو کی کھڑکی کے
سامنے مراقبے میں بیٹھے دکھائی دیئے۔ پھر حضرت اکبر کی نظم سُنائی۔ مجھے
ایسی بھائی کہ میں نے منگا قلم دوات اسی وقت اس کی نقل لی۔ اور ہاں
بیوی ایک اور اچنبھے کی بات سناؤں کہ عورتیں بھی شعر کہنے لگیں۔ استانی
نے مجھے علی گڈھ والی عزیزہ خاتون صاحبہ کی دو نظمیں سنائیں، ایک علی برادران
کا خیر مقدم اور دوسری مہاتما گاندھی۔ دونوں نظمیں لاجواب ہیں۔ پہلی نظم کی
بحر عجیب انوکھی سی ہے۔ مجھے بہت پسند آئی۔ پانچ پانچ شعر کی ٹکڑی ہے۔ اور کل
نو ٹکڑیاں ہیں۔ اس کی آٹھویں ٹکڑی مجھے دل سے بھائی۔ فلسفۂ آزادی کوٹ
کوٹ کر بھر دیا ہے۔ نویں ٹکڑی میں محترمہ خاتون نے اپنے خط کی بات سمجھانے کو
ظفر علی صاحب کی شمولیت لفظ تینوں کا استعمال کر کے چاہی ہے۔ بہن میری

منہ زوری کو معاف کریں۔ ان کی شمولیت اوپری ہے۔ دل سے نہیں۔ ورنہ ان سڈول موتیوں کی لڑی میں یہ کھونٹی ٹھیکری نہ ڈالتیں۔ دل کی بات ہی اور ہوتی ہے خدا لگتی کہنا کہ جو بات اس میں پیدا ہوتی ہے "دونوں کو ہو راحت عطا" وہ بھلا "تینوں کو ہو راحت عطا" میں کہاں۔ اور پھر مثل مشہور ہے کہ دو ہیں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا ہوتا ہے۔ میری اس ناچیز رائے سے بہن یہ نہ اخذ کریں کہ اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے میرے دل میں ظفر علی صاحب کی طرف سے کھوٹ ہے۔ اللہ میاں نے ہم عورتوں کے دل مردوں کی طرح کٹر نہیں بنائے کہ ہمیش ہمیش کو بیر بغض رکھیں۔ زود رنج بے شک ہم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ جی میں گانٹھ ڈالیں۔ ہمارا غصہ دودکا ابال ہوتا ہے۔ بری بات ہوئی اس کا رنج ہوا۔ آپ ہی آپ گھول کر رہ گئے۔ اب بے چارے ظفر علی سے کوئی باپ مارے کے بیر تھوڑی ہی ہیں بھول چوک انسان کی گھٹی میں۔ لغزشیں بڑے بڑے پیغمبروں سے ہوئی ہیں شیطان اچھوں ہی کا دشمن ہے۔ اور ان کی تاک میں سدا لگا رہتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو بہن ان کی شان میں کوئی الگ ہی نظم لکھتیں۔ اور ہاں کوئی علی گڑھ کی بیوی ہیں۔ ان کی ایک نظم نعرۂ مسلم بھی استانی نے سنائی۔ اس کے چھٹے۔ بارہویں اور تیرہویں شعر میں بڑی مزے کی چوٹیں کی گئی ہیں اور ایک اور نظم مثنوی کے طرز پر ہے کوئی سید قاسم شاہ میرٹھ کے رہنے والے ہیں ان کی بیوی نے لکھی ہے

اپنے ایمان کی قسم غضب کی ہے۔ "گریۂ مسرت" نام ہے۔ اُستانی نے اس مزے سے سُنائی کہ میں عش عش کرتی رہ گئی۔ مضمون یہ ہے کہ کوئی کلونتی لاج کی ماری۔ ساون بھادوں میں اپنے پی سے بچھڑی پڑی ہے۔ دل ہی دل میں گھٹ کے رہ جاتی ہے۔ برکھا کی بہاریں جان کا جلاپا ہیں۔ اور اس ظلمی کی یاد کو رہ رہ کر تازہ کرتی ہے۔ دل کی گتھیاں بیٹھی سُلجھا رہی تھی۔ اپنا دل پریشان ہوتا ہے تو کوئی چیز بھلی نہیں لگتی در و دیوار سے پریشانی ٹپکتی ہے۔ اِس مضمون کو کس سہولت سے ادا کیا ہے۔ شعر

در و دیوار پہ اُداسی تھی

چشم و ابرو پہ بدحواسی تھی

ذرا مصرعوں کی ترکیب پر غور کرنا۔ کیوں بہن! اگر نثر میں اس خیال کو ادا کریں تو الفاظ کی اس سے بہتر اور کونسی ترتیب ہو سکتی تھی۔ بخدا ذرا کہیں بناوٹ اور لفاظی نہیں۔ قدرتی جذبات کو جوں کا توں سامنے تصویر کھینچ پیش کر دیا ہے۔ اِس کے بعد بے ساختگی کے ساتھ منظر بدلتا ہے۔ اور اپنی دھن میں سُست بیٹھنے والی اور میاں سے دل ہی دل میں باتیں کرنے والی جب کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنتی ہے۔ کیسی اپنے خیال سے چونکتی ہے۔ یہ روزمرّہ کی باتیں ہیں۔ اور جو بدنصیبی سے اِس بلا میں گرفتار ہیں وہ بارہا تجربہ کر چکی ہیں ذرا کلیجہ پہ ہاتھ دھر کر سُنیں شعر

دفعتاً چاپ سی ہوئی محسوس
ہل گیا خوف سے دل مایوس

اس کے بعد جتنے شعر ہیں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ سچے جذبات کا بہترین نمونہ ہیں۔ میں نے تو اتنی عمر ہونے کو آئی اس سے بہتر روزمرّہ کی زبان میں سادگی اور خوبی سے ادا ہوتی ہوئی کوئی نظم نہیں دیکھی۔ میاں کو جب یہ ترسی ہوئی دیکھتی ہے تو مارے خوشی کے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔ اور اس نگوڑے کو دیکھو۔ کیا پتھر کا کلیجہ ہے۔ چھیڑ خانی سوجھتی ہے۔ چندر اکے کہتا ہے "میرے آنے سے کیا ہوئی ایذا" اور رونے کا سبب دریافت کرتا ہے۔ کہتے ہیں لال کو دیکھ کے چھتّی چہکتی ہے۔ میاں کی چھیڑ نے جان میں جان ڈالی۔ سنو کیا جواب دیتی ہے اور آنسوؤں کو کیا بتاتی ہے کہتی ہے کہ آنکھیں تمھاری جدائی میں روتے روتے ماندی ہو گئیں تھیں۔ اب جو تم اصل خیر سے آئے تو یہ اچھی ہوئی ہیں۔ اور "آج آنکھوں کا غسلِ صحت ہے" لکھنے والی کیسی سہاگی بیوی ہے۔ سید قاسم شاہ نصیبے کے سکندر ہیں جو ایسی ہیرا بیوی ملی۔ الٰہی سہاگ قائم رہے اور گھس گھس کے جوڑی اترے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی دینی بہن وبنا ول اچھی میں کیسے باور کر لوں کہ یہ باہر والی ہیں۔ ان کی زبان میں تو کوئی بات باہر والوں کی سی نہیں اپنے شہر کی سی ٹھیٹ زبان ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں کے گھروں میں پلی ہیں۔

ماما پر زوال، ایک اور مضمون اُستانی نے سُنایا۔ اور اس کے اختتام
پر جو اُنھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ سُننے کے قابل تھا۔ باتوں باتوں
میں بیبیوں پر گجّی چوٹ کر گئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ غرض اُستانی نے ایک
سے ایک بڑھیا بات سُنائی۔ باہر والوں کی باتیں بھی اپنی ہی بولی میں سنا گئیں
میں تو اُن پر لٹو ہو گئی۔ معلوم نہیں یہ اُستانی کوئی جادوگرنی ہے کہ ایسی پُرکی
سب پر ڈالی کہ جو بیٹھا سُن رہا تھا اُستانی کا دموں دیوانہ ہو گیا۔ اور لگا
اُستانی کا دم بھرنے۔ لال جوڑے کا حال کھلا کہ بچیوں سے بھی تو ڈانڈا
مینڈا رکھتی ہیں۔ انھیں بھی خوش رکھنا ضروری ہے۔ ہمسائے میں میری
ایک ملاپ دارنی ہیں۔ انھوں نے جو ہمارے یہاں یہ چہل پہل دیکھی اور اُستانی
کا حال محلّے والیوں سے سُنا۔ ہزاروں منّتوں سماجتوں سے اُستانی کو
بلا بھیجا۔ اب تو بی اُستانی دلّو کا دسیرا (دس سیر کا وزن) ہو گئیں جگہ
جگہ اِن کی پوچھ ہونے لگی۔ اچھی بھلی بیویاں ان کے پیچھے دیوانی ہو گئیں
اب شاید تم کہو کہ معمّے کیا ہے اور اُستانی کا نام کیا ہے۔ سو میری جان! استانی
کا نام اُستانی ہی ہے۔ اور وہ خواجہ بانو صاحبہ کی زیرِ ادارت دلّی سے مہینے
کے مہینے نکلتی ہیں۔ افسوس میرے پاس میراجی اور ہمدار کے ہی دو پرچے
آئے انھیں تمھارے دیکھنے کو بھیجتی ہوں۔ نگوڑے سال پہ ... روپلّی کوئی
ایسی بڑی رقم نہیں۔ اس پر سے قربان کی تھی۔ تم ضرور ... ذرا اس کو منگا کر

پڑھنا۔ اور اپنے نام جاری کرا لو۔ میری یہاں جتنی بہنیلیاں ہیں۔ سب منگانے
کو کہتی ہیں سردی غضب کی پڑ رہی ہے۔ نگوڑے جاڑے کا جانے پیٹ پھٹ گیا
ہے۔ لکھنے کو تو تم کو لکھ رہی ہوں لیکن انگلیاں مارے ٹھنڈ کے پالا ہو گئی ہیں
بالا پوش میں دبکی بیٹھی ہوں۔ کھانا تیار ہے۔ اس کی دہائی مچ رہی ہے۔
محمود تو بڑا پیارا پیارا ہو گیا ہو گا۔ میری طرف سے خوب بھینچ بھینچ کر پیار
کرنا۔ سنجھلی بھابی جان سارے دن کیا کیا کرتی ہیں۔ میری تسلیم قبول
فرمائیں۔ اچھا لو بیوی! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے میں جاتی ہوں۔

اللہ بیلی اللہ نگہبان
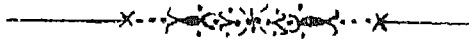
محل سرائیں

"چھبنا جانی"

"جی اماں جان"

"اماں جیو تم - اماں کی جان - تم پہ بندی قربان - کہو علی گڑھ میں بہن آپا دیتی کے بچوں کا کیسا خیر مقدم ہوا"

جہاں آرا بیگم شام کی گاڑی سے آئیں انھوں نے جلوس جو علی گڑھ کے بازاروں میں نکلا تھا اس کی کیفیت سنائی کہتی تھیں - جابجا کوٹھے کوٹھے ماڑی ماڑی چھتوں چھتوں پر عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے - بازاروں میں مردوؤں کا وہ ہجوم کہ تھالی پھینکو تو سر پر چلے - اچھی ان مردوؤں کے دیدے کتنے موٹے ہو گئے ہیں کہ ذرا نہیں ڈرتے - ابھی نگوڑا تھکا راجنگی بخار آیا - لاکھوں اس کے نیگ لگے - جب جا کے سرکار کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی کہ اب تو تمانے سب مر گئے - اب کون بھرتی ہونے کو رہا ہے - تو خدا خدا کرکے لڑائی بند کی - اب جو یہ عقل کے دشمن گھروں سے نکل نکل کر پھر اس طرح بھیڑ بھڑکا کرینگے ! اور سرکار دیکھیگی کہ نہیں ابھی ہزاروں مردوئے زندہ ہیں - لاکھوں کی فوج تیار ہو سکتی ہے - پھر لڑائی چھیڑ دیگی تو اچھا ہوگا - شاباش ہے

ان کے جگروں کو کہ ذرا خوف نہیں اسی لیئے تو زیادہ پڑھانا ٹھیک نہیں۔ نہین نہین انگریزی کے حرف پڑہتے ہی ادہر نگاہ پہ زور پڑا۔ اُدہر دماغ پہ ایلو دل چل نکلا۔ لگے بہکی بہکی باتیں کرنے۔ اے بھلا شوکت علی محمد علی کو دیکھو اُنھوں نے تو پڑھ کے بھی ڈبویا۔ نگوڑا گدھوں پہ علم لادا۔ اے قابل تھے۔ پڑھے لکھے تھے۔ سرکار سے دبے رہتے۔ لالوں کے لال بنے رہتے۔ کوئی خطاب ملتا۔ ہزار دو ہزار کا گزارہ مقرر ہوتا۔ بڑے صاحب کے ہاں کرسی ملتی۔ اُنھوں نے یونہی اپنا ہدڑا اکھویا۔ قوم قوم بھاڑ میں گئی تھی قوم کہ اپنا ہی قوام تیار ہو جائے۔ دریا میں رہنا مگر مچھ سے بیر۔ رہیں سرکار کے ملک میں اور نکالیں ان سے اوڑپیچ کھڑپیچ۔ بھلا یہ کون سی عقلمندی ہے کہ لگے گڑے مردے اکھاڑنے کہ اگلے لاٹھ نے یا نسو ڈھاکے کے جولاہوں کے ہاتھ کٹوا دیئے کہ ہندوستان سے باریک کپڑا بننے کی صنعت ماری جائے۔ ڈھمکے لاٹھ نے فلاں نواب سے عہد و پیمان کیئے اور اُن کو بالائے طاق رکھ علاقہ دبا لیا۔ اس فلانے کرنیل نے بڈھے بادشاہ کی ڈاڑھی پکڑ لی اور طمانچے مارے منہ پہ تھوکا۔ اس ارنیل نے ظفر کے بیٹے پوتوں کے سر اُتار لیئے ارے بھیا! تو تجھ کو کیا۔ تیرے یہ کوئی سگے تھے۔ تجھ کو برائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔ تو خدائی فوجدار بن کے آیا ہے۔ اُنھوں نے بُرا کیا تو اُن کے گور گڑھے میں۔ کیا سدا کو یہاں رہ گئے۔ تو جو پرائے کارن اپنی لال

سی جان کو عذاب لگائے تو کے رکعت کا ثواب۔ اور پھر کن کے لئے نگوڑے ان نفاخت بندوستانیوں کے لیے کہ میں مروں تجھ پہ تو مرے موٹے موٹے ڈھینگر دو پہ۔ یہ تو دشمنوں کی جان قوم نگوڑی کے لیے نکالیں اور وہاں ان کی کان پہ جوں نہ رینگے۔ بھلا ایمان سے کہنا۔ تجھے دلّی میں یہ کچی کھال اُترے پکڑنے آئے تھے یا تیرے اپنے ہی بھائی تھے۔ جہاں جہاں اب سے دور ہندی خانے گئے ہیں رہے۔ نگہبان تیرے اپنے ہی تھے یا یہ بدیسی۔ بندے بڑے بڑے قاق ہو اچھی نرد کی جان کو روگ لگایا۔ پچھلی اپنی جان سے گئی کھانے والوں کو مزا آیا اپنی اپنی کرنی اپنی اپنی بھرنی۔ اپنے لیئے یہ سب اپنے آپ کر لینگے۔ بھلا ان کی کیا جوتی کو غرض پڑی ہے کہ مفت میں درد سر مول لیں۔ بھلا کہو عقلمند اپنے دھندے سے لگتا۔ سرکار کی خیر خواہی کرتا۔ میٹھے میٹھے بولوں سے ان کا دل لبھاتا۔ تو آج کو ہزاروں کی جائداد اور لاکھوں کی املاک کھڑی ہوتی۔ خود عیش کرتا اور گھر والوں کو الگ راج رچاتا۔ مگر گردش جب آتی ہے تو عقل اندھی ہو جاتی ہے۔ اب جو یوں کہو کہ قوم میں عزت ہوئی۔ بھری دلّی میں وہ استقبال ہوا کہ لاٹ صاحب تک کا نہوا تھا۔ دنیا کہتی ہے کہ ایسا جلوس اور اس دھوم دھام کا نہ دیکھا نہ سنا۔ گھر گھر روشنی اور گلی گلی روشنی تھی۔ خوشی کے مارے آدمی پھٹے پڑتے تھے۔ بس نہیں تھا کہ محمد علی شوکت علی کو دل میں بٹھالیں آنکھوں میں رکھ لیں۔ ان کے قدم قدم پر دل قربان اور آنکھیں نثار ہوتی تھیں۔ بڑے

بوڑھے کہتے ہیں کہ بس اکبر شاہ کا جلوس ایسے جوش اور خلوص سے نکلا تھا۔ یا یہ
اب دیکھا۔ چلو یہ سب کچھ سہی۔ لیکن نتیجہ کیا۔ یہ سودا اور دل میں سمایا ہے کہ حکومت
خود اختیاری مل جائے۔ ہائے۔ پڑھ جاؤ، لکھ جاؤ لیکن پھر بچے ہو۔ اچھی اچھی
میری آتو۔ مغلانی اور ساری مامائیں مل کے کہنے لگیں کہ سرکار ہم تو بیوی
بنتے ہیں۔ یا تو میں انھیں دیوانی سمجھونگی اور جو جھائیں جھائیں کر مرے ہوئیں سر
تو بھی کہونگی کہ قطاماؤں ہوش میں رہی ہو یا دل کے کونے سرک گئے اور
اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے یہ سب مل کے مجھے جھپٹ ہی پڑیں اور لگیں میرے
مدعیوں کی بوٹیاں نوچنے۔ تو ہاں میاں زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ لیکن یہ تو مجھے
اطمینان ہے کہ اتنی انکی ہمت کہاں اور یہ ان کا دل گردہ کہاں۔ بی آتو ہیں وہ
چاہتی ہیں کہ سرکار کو میں مٹھوں میں لے لوں اور بی مغلانی اس کی خواہاں
ہیں کہ سرکار میری گرفت میں آجائیں۔ مامائیں یہ چاہتی کہ بیگم ہمیں منھ پر لگائیں
بس ایک کی ایک کاٹ کرتی ہے اور ایک کی ایک اکھاڑ۔ یہ تو میں نے ایک چھوٹی
سی مثال دی ہے۔ خانہ داری، کنبے رشتے غرض سب جگہ ہی اللہ کی سنوار
ہے۔ پہلے گھر کی اصلاح کرو۔ پھر باہر سہی۔ ماں کی خدمت سب پر مقدم ہے۔ ان کی
ماں ضعیف، اپنی دو بچوں پہ جوانی تیر کی، رنڈاپا کاٹا۔ کہ ان کے سکھ دیکھے اللہ
نے پروان چڑھایا۔ کمانے دھمانے قابل ہوئے۔ تو یہ دل میں سمائی۔ باہر پھر
ٹھنڈی ہوا ٹھنڈا پانی میسر ہوتا۔ پانچ برس ہوئے۔ کہہ دینے کو دو لفظ ہیں۔ لیکن

ابھی کوئی یہ کہدے کہ چلو گھر میں رہنا۔ لیکن صلابت کوچے کی صحنچی سے باہر نکلنا
تو میں تو کپڑے پھاڑ کے نکل کھڑی ہوں۔ دو ہی دن میں دیوانی ہو جاؤں۔
کہاں کے پانچ برس کی قید کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ لیکن اب بھی تو کان نہیں ہوتے
کہ اب تو مان جائیں۔

اماں۔ بندی خانے میں پڑے پڑے تو سوکھ کے کانٹا ہو گئے ہونگے؟

"نہیں اماں جان! وہ تو اور خوب موٹے ہو کر آئے ہیں"

"دو کی حسف تمھاری نظر! یوں کہو۔ مزاج میں ابھی بچپنا ہے۔ اپنے مدرسے
میں آئے۔ دنوں کے تھے ترسے بلکے اپنے مدرسہ والوں کی صورتوں کو ترستے
ہونگے۔ اب جو چھٹے تو اُدھر کی لو لگی۔ اور ملنے چلے۔ مارے خوشی کے
پھولے نہ سمائے۔ ماشاءاللہ موٹے ہو گئے ہونگے۔ میں تو پھر یہی کہونگی
کہ اے اللہ تو ہمارے بادشاہ جم جاہ کو سلامت رکھیو الٰہی وہ صد سی
سال جئیں۔ اپنے بچوں کی بہاریں دیکھیں۔ نہ ان کو خبر ہو اور نہ ان بیچاروں
کی بندی کھلے اور چھوٹیں۔ بھلا ایک اکیلی جان کس کس کی خبر رکھے۔ یہ اور بیروا
غضب کے ہیں۔ وہ تو اپنی ذات سے میاں ہیں۔ دلّی دربار میں میں نے صورت
دیکھی تھی۔ کیسی پیاری پیاری تھی۔ اپنی رعیت کو دیکھ دیکھ کے شاد شاد اور
باغ باغ ہوتے تھے۔ جس دن گئے ہیں کیا شہر پر اداسی اور سناٹا تھا۔ میں تو
سارے دن خوب روئی۔ اور تین روز سے سلامتی سے پہنچنے کی مانتی تھی۔ دلو

رکھ چکی ہوں۔ کمبخت دھڑکن پیچھا نہیں چھوڑتی جو باقی کا رکھوں۔ اللہ وہ پورا کراہی دیگا۔

"اماں! شوکت علی اور محمد علی تو چلو سمجھدار بھاری بھرکم موٹے تازے ماشاراللہ پانچ پانچ ہاتھ کے مردوئے۔ اور پھر شوکت علی کی زبان ہاتھ بھر کی کندے پہ پڑی وہی۔ دم بھر میں چاہے جس کے چھکڑے اُڑا پھینک دیں۔ اور اب تو یہ طرہ اور ہوا کہ مولٰنا عبدالباری صاحب فرنگی محل والے نے مولویت کی دستار اور باندھ دی۔ اب تو بات بات پہ کفر کے فتوے ہونگے۔ جس کو اپنے خلاف دیکھینگے کافر کہدینگے۔ یہ تو اب ولی ہوگئے۔ اور سب طرف سے بے خوف۔ مگر یہ کہو کہ یہ لال ٹیپاں اُڑائے بھتنوں کی سی چوٹیاں لٹکائے بھڑ بھونجے کے چڑے جو ساتھ چوں چوں کرتے ہوئے اور ان استادوں کی عقلوں کو کیا مار ہوئی جو نکلنے دیا۔ کیا اُنھوں نے یونہی دھوپ میں بال سفید کیے ہیں۔ ذرا لڑکوں پہ تابہ نہیں بٹھایا جاتا۔ نگوڑے میّا باوا جانے کہاں کہاں سے کاٹ کسور کران کے پوتے پورے کریں آبروئیں نبائے بیٹھے ہیں اِس اُمید پر کہ بچّہ سیانا ہو پڑھ لکھ کر فارغ تحصیل ہو سرکاری نوکری ملے۔ کوئی بڑا عہدہ ملے۔ اب جو یہ شیطانی لشکران دو دیوانوں کے پیچھے تالیاں بجاتا ساتھ ہولے تو اچھے بچھوں کے آئے اوائے اوسان چلے جائیں اب ایک ایک لڑکے کو پکڑ پکڑ وہ چار چوٹ کی مار دی ہوتی کہ یاد کرتا۔ پیسے پہ رکھ کے

بوٹیاں اُڑائی ہوتیں۔ ابھی انگریزوں کو خبر ہو کہ مدرسے کے لڑکے یہ اودھم ڈھاتے
پھرتے ہیں، اپنے ایمان کی قسم ہے جو ایک کو بھی نوکری ملے۔ بھلا ایسے ناگنوں کو
کیا نوکری ملے جو کھائیں اور شیر کی طرح غرائیں۔ بٹیا نیکے ہر کوئی لیتا ہے یا پینگو
تو کوئی بھی نہیں لیتا۔ نگوڑی عقلوں کا وصال ہے۔ ان ہندوستانیوں کو ظاہر
داری تو ذرا آتی ہی نہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ وقت پر گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں۔
اپنا ہاتھ دبا ہوا ہے۔ شحنہ رہے شحنہ مجھے تیرے گاؤں رہنا۔ اونٹ بلیاں لے گئیں
تو ہاں جی ہاں جی کہنا۔ کوئی سمجھ کی بات ہی نہیں نکلتی۔ ان موئے حردوں نے وہ
غل مچایا استبدادی استبدادی۔ استبدادی نہ ہوئے شادی ہو گئے۔ یوں
کھو سمجھ دار ہی زمانے کا رنگ دیکھ کر کام کرتے ہیں۔ موقع کے موافق بات کرتے
ہیں اور اپنا بھلا کون نہیں چاہتا۔ جس نگوڑے کے دل کا کونا ہی سرک گیا ہوگا
وہ تو آنکھ بند کر کے اور منہ کھول بھائیں بھائیں کرنے لگیگا۔ ورنہ موقع اور مصلحت
بھی کوئی چیز ہے۔ یہی تھوڑی کہ اٹھ دوڑی بازار دل میں ایسی آئی۔ ایسا ہی تو
دل چلا آگے کو جوتیاں کھلواتا ہے۔ اب دیکھ ہی لو نا کم بخت پنجاب میں بھاڑ ہی
جھونک دیا۔ اب کھوکس کے دیدے گھٹنوں کو بیٹھ کے روئیں۔ پنجاب میں تو سنا ہے
کہ مرد کے نام چڑیا کا بچہ نہیں رہا ہے۔ پہلے زبردستی گھروں میں سے گھسیٹ گھسیٹ
بھرتی کیا۔ پھر جہاز بار لگا کے۔ جو نگوڑے چھپ چھپا کے گھروں میں رہ گئے
جنگی بچار کے سینے کھول اٹھیں ہوا میں اڑا اس کی تفتیش چڑھا یا۔ جو سے بچے بچرتے

سخت جان اس سے بچے انھیں کوئی کرموں جلیوں والا باغ ہے۔ اس میں لٹایا۔
لو وہاں کا توصفایا ہوا۔ اب رانڈیں اور یتیم رہ گئیں بڑوں کی جان کو بیٹھ کے۔ اب
یہ جو کہو کہ چندے کر کر کے ان کے پورے ڈالینگے۔ تو کہیں اوسوں پیاس
بجھتی ہے۔ ان چندوں کے چند ٹکوں سے ان آفت زداؤں کے آنسو پونچھ جائینگے۔
جو جانے والے تھے وہ گئے۔ پیچھے رہنے کو انھیں چھوڑ گئے۔ اور یہ جو چلاؤ کہ ہم
ان شہیدوں کی یادگار قایم کرینگے۔ تو چلو بھر دوں! تمھاری کسی بات میں نہی بھدر کہ
ہے۔ یہ جو اپنی جانوں کو پیٹو کہ یہ آزادی کے شہید تھے تو کیا تہتر کے شہیدوں کو
بھول گئے وہ تو حقیقت میں اپنا ملک چڑھانا چاہتے تھے۔ اس کا خمیازہ یہ بھگتا کہ
شہر میں گدھوں کے ہل چلوائے۔ کابلی دروازہ سے دلی دروازہ یا راجگھاٹ
دروازہ یہ سارا لال حویلی اور جمع مسجد کے درمیان کا میدان بستی ہی بستی تھا۔
اور بستی بھی وہ رونق کی کہ نہ جس کی دید ہے نہ شنید۔ ہزاروں مسجدیں، مدرسے،
گھر، بازار، خلقت کا وہ ہجوم کہ کانوں پڑی آواز نہ سنائی دے۔ کیا ہوا۔ آج
چٹیل میدان ہے۔ ایک طرف سنگ باسی کی مسجد دوسری طرف جینیوں کا مندر۔
بیچ میں سید ہرے بھرے۔ شاہ حکیم اللہ صاحب شاہ جہاں آبادی اور سید چھوٹے
تھے مزار رہ گئے۔ نہ وہ بازار رہے نہ وہ سڑکیں رہیں اور تیمور کی بادشاہت نہ رہی
تو اور تو کس گنتی میں ہیں۔ ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اچھا کر گئے بعد میں نام روشن ہوگا
برا کر گئے پھر سب جہنم میں تھو تھو کہیں گے۔ اور ہزار کیڑے ڈالینگے اور کہنے کو

مُنھ پہ نہ کہو ویسے کیا کہنا چھوڑ دیتے ہیں۔ بُری بات کس کو خوش آتی ہے۔ شہر والے دیکھو کن دھاڑوں کو پہنچے۔ رنڈیوں کو محتاج ہوئے۔ لاکھوں پھانسیوں پر لٹک گئے، بیسیوں کلونتیاں کل کی لاج کو کوؤں میں ڈوب ڈوب مریں۔ ہزاروں کو خاکی لے گئے۔ ہزاروں بدبسیوں نے خراب کیں جنھوں نے وہ ساکھا دیکھا ہے ذرا اُن کے دلوں سے پوچھو۔ ذرا میاں تم انگریزی ٹوپی اوڑھ اور پیٹے باز کے اودی ٹاٹ پہن آنا۔ پھر دیکھو میری مانی کا جھل جھل مُوت نہ نکل جائے تو جدی کہنا۔ بیچاری جب کا خوف کھائے ہے۔ ایسا سہم ان کا بیٹھا ہے کہ اتبک انکی نقل سے لرزتی ہے۔ تو پوچھو ان مُصیبت زدہ بدنصیبوں کی قبر پر تم نے کئے دفعہ جاکے پیشاب کیا۔ جو تم سے آگے کسی بات کی توقع ہو۔ اور یہ ہندوستانی اپنے نمایندوں کی میت ہوں۔ تو بہ! اگر قرآن کا جامہ پہن کے آجائیں تو میں نہ باور کروں۔ آگ دے تماشہ دیکھنے والے ہیں۔ آگے دے کے مروادیں۔ جانے ان شوکت علی اور محمد علی کی کیا سمجھوں پہ اُنھوں نے بُرکی ڈالی ہے۔ جو ان پر وہ اتنا بھروسہ کر رہے ہیں یہ کاٹی اُنگلی پہ کسی کی نہ موتیں۔ اِن سے کسی فلاح کی اُمید رکھنی عبث ہے۔ بیچاری بڑی بی پہ ترس کھائیں۔ ان کا ضعیفی کا عالم ہے۔ ان کی خدمت کریں۔ کوئی بیچ میں پڑ کر سعی سفارش کر کے سرکار سے صفائی کرا دیگا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ دوسرے وہ خود سمجھدار ہیں۔ اپنا تجارت کا کام شروع کردیں اس میں ہی پو بارے ہیں۔ اللہ نہ کرے کسی کے دست نگر تھوڑی ہیں۔ وہ تو

اور ہزار کو کما کے کھلائیں۔ لیکن بغیر حکام کو خوش کیئے یہ بحالی ناممکن ہے۔ حسرت موہانی کو بھی دیکھ کر اگر عبرت نہیں پکڑتے تو بی بس ان کا اللہ حافظ ہے۔ حسرت کو دیکھ لو کیسا چپ چاپ تماتا کام کرنے والا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اپنی دُھن کا پورا کام کیئے جاتا ہے۔ نہ مال کی پرواہ نہ دَھن کی غرض۔ قیدیں بھگتیں، چکیاں پیسیں اور عثمان غنی کی طرح کپڑے کی تجارت سے گھر کی کفالت کرتے رہے۔ یہ بڑے قید ادھر ہوئی چوری۔ ناشاد نامراد جھاڑو ہی دے گئے۔ تیلی تیل لے گئی شرف ذی عزت غیرت دار ناک والے کی طرح گھر کا بھرم کیسے غیر پہ کھولیں۔ کس کے آگے روئیں مگر کیوں ری قوم! اس وقت دیدے ٹم ہو گئے تھے۔ گھٹنے ٹوٹ گئی تھے۔ بڑی ہمدردی تھی۔ بڑی آگ تھی۔ بڑا جوش تھا۔ گھر پر جاتے۔ حسرت جیسے تم سے باپ کی طرح محبت کی اب اس کی خدمت کرتے۔ نہیں۔ نگوڑے بلوں میں پڑے سویا کیئے۔ اِس غریب کا خوب دھڑی دھڑی کرکے نقصان ہوا۔ اب جو یہ کہو کہ کیوں ہم نے تو ہر طرح سے خدمت کرنی چاہی اُنھوں نے منظور نہ کی۔ تو کیا ان کی بلا کو غرض پڑی تھی جو پرایا احسان اُٹھاتے وہ تو جو کرتے ہیں خدا راہ کرتے ہیں۔ داتا کے دس ہاتھ اور دینے کے سو بہانے۔ تم نے خدمت بھی تو کس بھونڈے پن سے کرنی چاہی کہ ہر شریف ناک والے کو عار آئے۔ ان کے ہاں کے مال کی زیادہ مانگ کرتے کتابیں خریدتے۔ کپڑا خریدتے کہ ادھر وہ منگاتے ادھر تم ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اب سُنا ہے کہ بیچارے کی دوکان پر بھی تو لوگ

مارے ڈر کے نہیں جاتے کہ کوئی انگریز نہ دیکھ لے۔ اور نوکری میں خلل آ جائے
یہ تو تمھاری ہمتیں ہیں۔ پودنے سے بھی گئی گزری کہ بادشاہ ماری پودنی ہم
بیر بسا دن جائیں۔ اچھی یہ باہر والوں نے شہر پہ قبضہ ولایت سے فوج لا کے کیا
تھا۔ ایسے ہی تو اپنے ہندوستانی تھے نا۔ یا کوئی سمندر پار سے آیا تھا۔ اب
ہاتھ کٹا کے لگے لٹھ پونگا ٹٹولنے۔ ساتھ کھا کے ذات پوچھیں یہ کہاوت انھیں کے
لیئے آئی ہے۔ لباس ان کا اختیار کرو۔ طرز معاشرت ان کا نقل کرو۔ جو روؤں
کو لینڈی کتوں کی طرح لیئے لیئے پھرتے ہیں ان کی ریس کرو۔ بس نہیں جو ان کی
حرص میں ناچنے بھی ننگے لگو۔ اور اچھی پھر ان میں ہزار عیب نکالو۔ اللہ اللہ کرو
گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز۔ باتیں کھائیں تو ان کی سیکھو۔ اور بیزاری کا یہ
عالم۔ جواسوں پہ صدقہ دو۔ بڑے غیرت دار تھے بڑے جوشیلے تھے، تو
موؤں اپنی تہذیب کو جلاتے۔ تم تو نقل میں شرف لے جانے والے ہو۔
بس میاں بس سلام ہے اس مدرسے کی پڑھائی کو میں دہائی پوچھی۔ خدا لاشریک
کی قسم جو ڈاکٹر صاحب کے دسیوں خط میرے پاس نہ آتے اور وہ ہر طرح میرا اطمینان
نہ کرتے تو میں تو ہر گز ہر گز ایک چھینا کیا ہزار چھینا پیدا ہوتے تو اس مدرسے
میں داخل نہ کراتی۔ وہ نگوڑا تو دیوالیہ پہلے ہی نکل چکا تھا سنتی ہوں کہ ڈاکٹر
صاحب نے اللہ جھوٹ نہ بلائے تو کوئی دو ڈھائی ہزار خط مختلف آدمیوں کو مدرسے
میں اپنے اپنے اور رشتے کنبے داروں کے بچے داخل کرانے کو لکھا۔ جب جا کے

مدرسہ جما ہے۔ نہیں کبھی کا ڈھونڈا نکل گیا ہوتا۔

"نانی حضرت آپ کو خطوں کی تعداد کی کیا خبر؟"

"بیٹی! انہیں بچے بالوں سے سنتی ہوں کان گنہگار ہیں۔ لیکن اس کی شاہد ہوں کہ دس خط میرے پاس آئے کہ شبیہ کو بھیجدوں۔ نہیں میں نے تو جب وہاں کی ہوا بگڑی دیکھی تو اٹھا لیا تھا۔ اور اب میں ہرگز نہیں جانے دونگی۔ بیس ہزار کی جاگیر کی ضبطی میں اب یہ سو روپلی کا گزارا کرینگے بند۔ تو یہاں تو روٹیوں کے ٹوٹے اور پیٹ کے لالے ہیں۔ اچھا میں نے پڑھوایا۔ یہاں تو جانے کس طرح آبرو سنبھالے گھر کو لیئے بیٹھے ہیں۔ رہی اوروں کی حرص کرنی تو ان کے پاس تو روپیہ ہے لیکن کے دن کا۔ یہ نگوڑے خرمستے چاندی ہی کے بل اُچھلتے ہیں۔ اکنّی کانسی کی، دو آنی کانسی کی، چوانّی کانسی کی، اٹھنّی کانسی کی روپیہ اللہ رکھے کاغذ کا۔ نکل ہی آیا ہے نکالو انگریزوں کو پھر دیکھو کم بختوں! کوڑی کوڑی کو محتاج نہ ہو جاؤ تو جب ہی کہنا۔ تمہاری فلاح بہبود تو ان کی موجودگی سے ہے نہ کہ چلے جانے میں۔ اللہ نہ کرے۔ میرے منہ میں خاک کل کلاں کو چلے گئے۔ تو جاٹا کرنا ان چھینٹ لگے کاغذوں کو۔ میں تو ہاتھ جوڑوں اور پیروں میں روپٹا ڈال کے واپس لے آؤں اگر یہ جانے بھی لگیں۔ اب تو انہی کی ساری رونق ہے۔ ورنہ ملک میں دھرا کیا خاک ہے وہی نگوڑے ڈھاک کے تین پات۔ ان محمد علی اور شوکت علی کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ امریکی کون سے ان کی بائیں پسلی کے نکلے

اور فرانسیسی کون سے ان کے تحت جگر ہیں جن کے پاس جائینگے اور شکایت کرینگے
آنکھ کی بدیاں بھوؤں کے آگے ۔ اچھی کوئی ہندوستانیوں کی طرح ہیں ۔ سب کے سب
ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ۔ اپنے نین کھو کے در در مانگے بھیک ۔ ان سے کہنے
بھی بات کھوئی ہی ۔ اور بس میاں بس اب تم بھی جم جم مدرسے جانا" مرزا شبیہ بیچارا
کالج میں نیا نیا آیا تھا ۔ اس دنیا کو ابھی پوری طرح دیکھا بھی نہ تھا ۔ کالج میں بڑا
آدمی کہلاؤں اس کا سودا ۔ وہاں کی ہر ریت رسم کو کھود کھود کے پوچھتا
پرانے لڑکوں کے آوازے سب سہتا ۔ سمجھتا تھا کہ رس بس گیا تو پھر ان ہی
کا سا ہو جاؤنگا ۔ مجلس اتحاد کے جلسوں میں حصہ لیتا ۔ کچھ کچھ چیں کرنے کی کوشش
کرتا ۔ لیکن شریر لڑکے اللہ ان سے بچائے ۔ بیچارے کو چٹکیوں میں اڑاتے
لیکن یہ دھن کا پورا میر مجلسی کے معزز عہدے کے خواب دیکھتا تھا ۔ کالج کی
ہر ایک عزت حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ۔ سید محلے سے گزرتا تو لڑکے
کہتے بھونکا ! اگلی منزل میں چلتا تو کوئی دل جلا چیت سا فقرہ جڑتا ۔ لیکن یہ
ٹوپی کے ابرو پر آئے ہوئے کنارے کو اوپر ہٹاتا ۔ پیشانی کھولتا ۔ گردن کی
ایک خاص حرکت سے پھندنے کو ہلاتا ۔ جیب میں ہاتھ ڈالے ایک عجیب وقار
سے گزر جاتا ۔ گھر کی حالت سے بخوبی واقف تھا ۔ باوا انگھٹو سرکار کے ناراض
کرنے سے گزارا کھو ہی چکے تھے ۔ دادی کا ایک دم وہ اس پر دموں پوائی
تھیں سو روپیہ ان کے گزارے کے وہ سارا بار پوتے کی پڑھائی کا اٹھاتی

تھیں۔ اماں کا گزارا دو سو روپیہ خاندانی بیوی اس دو سو میں گھر لیئے بیٹھی تھیں۔ اور میاں کو الگ بھرتیں۔ گھر کا خرچ اسی قلیل آمدنی میں چلاتیں اور منھ سے اُف نہ کرتی تھیں۔ اب جو مرزا شبیہ نے دیکھا کہ دادی کے تیور بدلے ہوئے ہیں اور مدرسے سے اٹھا لینے پر تیار۔ تو بڑا سٹ پٹایا رات کا وقت تھا آتش خانے میں دادی کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ پردے پڑے تھے۔ بڑی بی بیس کلی کی نن سکھ کی سفید تہ پوشی کلیوں میں لہریئے کی چین لگی باداہی ملینے کی آستینوں دار مکری پہنے۔ کاکریزی سُرخ میاں تہ رضائی بانشتی گوٹ لگی ہوئی اوڑھے۔ ایک سیاہ مخملی تیک پر دو تکیہ کے پاس کانگڑی لیئے بیٹھی تھیں۔ سامنے ایک بڑی سی جالیدار بٹاری چاندی کی طرح جھک دھری تھی۔ کروٹ میں ایک ہشت پہلو چوکی پہ پیتل کا چراغدان رکھا جس میں کڑوا تیل جل رہا تھا۔ بڑی بی کو سودا تھا کہ مٹی کا تیل آنکھوں کی بینائی خراب کرتا ہے۔ سارے آتش خانے میں نرو جازم (جاجم) جس پر سُرخ پھول بڑے تھے اس کا فرش تھا۔ شبیہ مرزا انگریزی لباس پہنے منڈاڈ انیٹے دادی کے سامنے مؤدب بیٹھا تھا۔ اور دادی کے خیال کو دوسری طرف کرنے کی فکر کر رہا تھا۔ کہ اتنے میں پردہ اٹھا اور ایک مغلانی اندر آئی اور کہا کہ بڑی سرکار کا صاحبزادے کو چھوٹی سرکار یاد فرماتی ہیں۔ بڑی بی غصے میں تو بھری بیٹھی ہی تھیں فوراً تنخ کے بولیں کہ بیٹے کی ایسی ماتا اچھلی تھی تو یہاں کیوں نہیں آجاتیں۔ مغلانی الٹے قدموں ہٹ پردے کے باہر جا کیتی آرا بیگم سے کہا کہ بڑی سرکار کا غصنبی خانہ صاحبزادے

پڑا اتر رہا ہے۔ اور آپ کو وہیں یاد فرماتی ہیں۔ بیچنی مخمل کا آڑا پاجامہ بادامی ملینے کا بانکڑی کی ہمک لگا کف دار نیچا نیچا کرتہ پہنے۔ بادامی دلائی جس میں بھوری رنگ کی بالشتی گوٹ لگی تھی اوڑھے۔ وصلی کی دکھیت بھولی کے کام کی شیرازی پنجے کی جوتی پاؤں میں ڈال۔ صلابت کوچے کی سہ دری سے نکل نیچے اتریں۔ اور ساس پاس آتش خانہ میں پہنچیں جھک کے سلام کیا۔ ساس نے کہا۔ بوڑھ سہاگن برخوردار بیوی جیتی رہو! ساس کے سامنے سوزنی پر بیٹھ گئیں۔ بڑی بی بولیں کہ جہاں آرا کل شام کی گاڑی سے علی گڑھ سے آئیں ان کی زبانی شوکت علی اور محمد علی کے جلوس کا حال سنا۔ کہتی تھیں کہ اس قدر بھیڑ تھی کہ میں تجھ پر اور تو مجھ پر۔ سیلانیوں کا وہ ریلا تھا کہ جوتیوں کے کتنے جوڑے پیروں سے نکل نکل رہ رہ گئیں۔ سوسو گز آدمی زمین سے ادھر چلے جاتے تھے جلوس کی گاڑی پر آدمی پروانوں کی طرح گرتے تھے۔ مارے جوش کے اندھے ہو رہے تھے۔ وہ تو اللہ نے خیر کری کہ کوئی روندن میں آکے چھپا نہیں۔ دھکا پیلی میں لوگوں کے کپڑے پھٹ پھٹ گئے۔ وہ تو یوں کہو کہ بیچ پیٹ نہ پھٹ گئے اور آنتیں نہ نکل پڑیں۔ لیکن پسلیاں تو ضرور ہی بھینچ گئی ہونگی۔ یہ صاحبزادے بھلا کیوں نہ گئے ہونگے۔ یہ سب کے آگے ہونگے۔ پوچھ بیٹا تو صدا کا مضین (معنی مریض) وہاں پان سا تو پہلے ہی۔ آئے دن اختلاج گھبراہٹ کی شکایت۔ بھلا وہ نگوڑے باہر والے گنوار کہ ایک تو میاں تھے ہی تھے اوپر سے پی لی بھنگ

وہ تو جوش میں ہو رہے تھے دیوانے۔ دشمن گر پڑتے اور کچلے جاتے تو یہ اماں بندی کس کی ماں کو ماں کہتی۔ اسی لیے میں خلاف تھی کہ یہ بچے ہیں نا سمجھ ہیں ان کا الگ رہنا اور کہا کہ باہر جانا ٹھیک نہیں۔ لیکن میں تو سٹیا گئی ہوں۔ عقلمندوں کی دور بلا۔ بڑوں کی بڑی باتیں۔ تم اماں ہو جو تم کو خیال ہو گا کسی اور کو تھوڑی ہو سکتا ہے۔ تم نے درد اٹھائے، جنا، میں دادی کس شمار میں۔ ماں سے زیادہ چاہے پھاپھا کٹنی کہلائے۔ بیوی بچہ تمہارا ہے جو درد تم کو ہوگا مجھے نہیں۔ تمہاری مامتا ہے۔ میری مرضی نہیں کہ اب یہ علی گڑھ میں پڑھے۔ کہتے ہیں کہ خدا جھوٹ نہ بلائے تو کوئی اسی ہزار آدم ہو گا۔ آس پاس کے گاؤں قصبوں سے سب آ گئے تھے۔ خلقت کا یہ اژدہام تھا کہ ٹوٹی پڑتی تھی۔ اور بس نہ چلتا تھا کہ محمد علی شوکت علی کے پیروں میں آن کے لوٹنے لگے ہر ایک نثار اور قربان ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ کسی کے روکے نہ رکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تقریر نہ کر سکے اور اٹھ کر چل دیئے ایسی حالت میں اگر کوئی کچلا جاتا تو کسی کا کوئی کیا بنا لیتا۔ وہ تو یوں کہو کہ فرشتے اللہ کی طرف سے حفاظت کر رہے ہیں اور آدمیوں کو سنبھالتے ہوں گے ورنہ اس جوش اور بے قراری میں جانے کتنے کچلے جاتے۔ دیکھو صبح ہو جائے تو میں تم کو خود جانی بیگم (جہاں آرا) کی زبانی سارا حال سنواؤں گی۔

چھاؤں چھاؤں

(نامکمل)
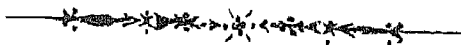
"اری گلچمن! او زینت، اے ہے نگوڑیاں کہاں غارت ہوگئیں، اچھی بوا جان، خدا کے لیئے جلدی یہاں آنا۔ دیکھو تو بڑی دلھن کو کیا ہوگیا ہے، اے بی خالہ منتو، اے بی خالہ منتو، اے ہے کوئی نہیں آتا۔ دوئی کیا ہوگیا ہے، منجھو تم تو کفن پھاڑ کر چیختی ہو۔ دوئی آخر ہے کیا؟ اچھی جلدی آؤ، دوئی میں کیا کروں، میرے اللہ!" چلّانے والی ایک بی بی کوئی تیس بتیس برس کی، پھنسا ہوا سفید آڑا پائجامہ، نیچا نیچا مہین آب رواں کا سفید کرتہ پہنے، جس میں کٹاؤ کا کام اور گلشن کی بیل ٹکی ہوئی تھی۔ دوپٹہ جو کچھ کندھے پر پڑا کچھ فرش پر جھاڑو دے رہا، بیازی رنگ کا تھا، تین چار دن کے بدلے کپڑے تھے، ہاتھوں میں کالی کریلا پنجیں اور گنڈھی کے منہ کے کڑے، گلے میں بادامی دانے کی چمپاکلی، کانوں میں ایک ایک ہیرا کاٹ کی بالی، بے چاری باولی بنی چیخ رہی تھی۔ دو تین چھوکریاں، خیلا، جان بیلا، اے ہے اے ہے کرتی سہ دری کی طرف دوڑیں۔ ایک ادھیڑ سی بی بی، جو خالہ منتو تھیں، ماتھے پر عینک رکھے ایک پاؤں میں جوتی دوسرے میں ندارد، سر کھلا لپک کے صحنچی میں سے نکل بھد بھد کرتی ہوا اس باختہ سہ دری میں در آئیں۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا منجھلی دلھن کا دھڑ تو

سوزنی پر ہے اور ٹانگیں چاندنی پر، ہاتھ پیروں میں تشنج، بجائے اس کے کہ اُسے سیدھا
کریں، یہ بھی لگیں چیخنے اور پیٹنے، چھوکریوں نے جو یہ دیکھا، تو اُنھوں نے اپنی آواز
سب پر دُرکی، کچھ اصلیت کچھ بناوٹ، سارے گھر میں ایک چیخ پکار مچ گئی - اب جو
بیوی یا نوکر آتی ہے سنبھلی دُلھن کی حالت دیکھ کر چیختی چلاتی اور کوئی اُس بے چاری کو
سیدھا نہیں کرتا - میاں بیچارا کوئی چالیس پینتالیس برس کا ہوگا وہ بدنصیب کہیں اس وقت
حمام میں تھا، حویلی سے جو ہائے تو چل اور آ سکے تو آ اور ڈھمکے تو دوڑ کی صدائیں سُنیں -
صابن مل چکا تھا، آنکھیں بند تھیں گھبرا کر ایک لوٹا سر پر ڈالا اور جلدی سے آنکھیں کھول دیں
صابن آنکھوں میں گھسا، آنکھوں میں ہوئی جلن اور لگے ٹپ ٹپ آنسو بہنے، جلدی سے
ٹانگوں میں اُلٹا سیدھا پائجامہ ڈال، کمر بند باندھتا زنان خانے کی طرف بھاگا - باہر
کے نوکر سامنے ڈیوڑھی پر چڑھے ہوئے اور آدھے آدھے دھڑ اندر ڈالے
دیں - ہر ایک مختلف سوال کرے، جواب کون دے - طرح طرح کی آوازیں مل
عجیب بھیانک ہو گئیں - میاں بیچارا کچھ گھبرایا، کچھ آنکھوں کی مرچوں کا ستایا
اب جو گھسے تو باریدارنی کے کھڑے کھٹولے سے کرتے میں کھونچ لگوائی، جھبر سے
دامن الگ ہو گیا، اندر آیا تو بیوی کو اس حال میں پایا، پاس ایک تار کا لال کاغذ پڑا
تھا، سمجھا کہ کہیں اس میں کچھ لکھا ہے - جلدی سے اُٹھا کر تار پڑھنا چاہا - گھبرایا ہوا
سانس الگ پھول رہا، ہاتھوں میں لرزا، آنکھوں تلے اندھیرا، تار کے الفاظ خاک
نہ سجھائی دیئے - ایک دفعہ نیچے رکھ دیا پھر فوراً بلبلا کر اُٹھایا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا

شروع کیا "حالت نازک ہے، فوراً چلے آؤ" دانش گاہ کی گھڑی! گھر میں اللہ آمین کا ایک بچہ سارے کنبے کی آیندہ توقعات اس کی بہبودی سے وابستہ، باپ کی محبت، سر چکرایا، دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا، عورتوں نے جو یہ حال دیکھا سمجھا کہ کسی کی سناونی کا تار آیا ہے، ہر ایک نے اپنے پیارے کی طرف لو لگائی اور خیال دوڑایا، خائف پہلے تھیں کچھ رنجیدہ کچھ ترسیدہ لگیں کھڑے کھڑے پچھاڑیں کھانے، سب کی ہائے واویلا سے بے چارے میاں نے ذرا اپنے اوسان بجا کیئے۔ گھنٹے پر نظر دوڑائی علی گڑھ کی گاڑی چھوٹنے میں آدھ گھنٹے کی دیر تھی۔ گھوڑا گاڑی جتتے تیار ہوتے تو گھر سے محطہ (اسٹیشن) تک کا راستہ کوئی ایک گھڑی کا ہوگا۔ پورا نا گھرانا، پھر دو تین نزلی نوکر سارے احدی، چار دفعہ کہو تو پھر کہیں جا کر تے احکام کی تکمیل کریں، گاڑی جتنے کا بے چارا اب حکم دیتا تو ایک گھنٹہ سے ادھر نہ جتتی گاڑی کے چھٹنے میں جو آدھ گھنٹہ کی دیر دیکھی، بولا کے اٹھا، اوٹ پر سے اچکن کو گھسیٹ کندھے پر ڈال سیدھے پیر کی جوتی الٹے میں، الٹے میں سیدھے کی پہن دیوانوں کی طرح گھر سے نکل بیٹا تو محطہ کی طرف بھاگا، گھبراہٹ میں ٹوپی اوڑھنا بھول گیا نوکروں نے جو میاں کی یہ حالت دیکھی اور اس طرح بھاگتے دیکھا گلی کے سرے تک دھڑ دھڑ کرتے پیچھے پیچھے بھاگتے چلے، اور ایک نے تو جسارت کرکے فوراً ہاتھ پکڑ لیا کہ سرکار خیر تو ہے۔ یہ بیچارہ گھبرایا ہوا تھوڑی دیر ہشت مشت کی،

سانس پھولا ہوا، جلدی سے گالی دے کر کہا کہ علی گڑھ جا رہا ہوں، اُلّو کی پٹھے
چھوڑ دے، اُس نے چھوڑا اور یہ لپکا۔ نوکر گھر پلٹے، حویلی کی آہ و بکا میں کوئی
کمی ابھی تک نہ آئی تھی، میاں بیچارا شہر کی بیچ در بیچ گلیوں سے بھاگا بھاگ کرتا
چلا جاتا تھا، گلیوں کے لونڈے دیوانہ سمجھ جلدی جلدی مکانوں کے دروازوں میں
اور دروازے کی چوکیوں پر چڑھ جاتے اور جب یہ کچھ دور نکل جاتا تو چلاتے
پاگل ہے بے! پاگل!! بیچارے نے جلدی میں کہیں اُلٹا پاجامہ پہن لیا، جس تیز
نظر کی اُس پر نگاہ پڑ جاتی وہ چلّاتا "دو اُلٹا پاجامہ گرٹ جینے" اللہ اللہ کر کے کہیں
بیچارا محطہ پہنچا، گاڑی تیار کھڑی، تیر کی طرح دروازہ پر پہنچا، بابو نے پکڑنا چاہا
لیکن یہ یہ جا وہ جا۔ اوّل چبوترے جہاں علی گڑھ جانے والی گاڑی کھڑی ہوتی
تھی آج اتفاق سے پنجاب گاڑی تھی، اس کو خبر نہیں گھبرا کر اس میں گھس بیٹھا۔
سر سے پاؤں تک پسینہ میں شور بشور، کھونچ لگا کرتا، اُلٹا پاجامہ، سلیم شاہی جوتی
اُس پر جو یہ رگڑ پڑی کتنا چر گیا۔ گھڑی الگ ہو گئی، آدھی کی سیون نے جدا
دانت نکوسے، پیروں پر دو دو اُنگل دھول چڑھی ہوئی، بالوں سے صابن
پوری طرح نہ چھوٹا تھا، ہوا سے بال ہوئے خشک، اور جڑوں میں اُن کے آیا
پسینہ، لگے چپ چپ کرنے، سارے ڈبے کی مکھیاں بیچارے پر پل پڑیں
جل جل کے انھیں اُڑاتا، لیکن وہ بے غیرت بھن بھن کرتی کبھی ناک کے بانسے
کو نوازتیں، کبھی کوئی جا کوے کو سونڈ پنجوں سے کریدتی، غرض نتھنوں میں دم

کردیا اور مسافروں نے جو یہ حال دیکھا، ہمدردی سے اس کی طرف سمٹ آئے
اور لگے حال پوچھنے اور ہزاروں سوال کرنے، اس نے کہا کہ میاں خدا مہاتما
گاندھی اور شوکت علی محمد علی کو غارت کرے انھوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا، ان
قومی دیوتاؤں کے خلاف جو یہ سخت کلمات لوگوں نے سُنے چپاؤں پیاؤں کر سب
سر ہو گئے، اور ایک نے بڑھ چیت رسید کی، ایک بڈھے نے کہا کہ میاں اس
دیوانی کی بھی تو سُن لو کہ آخر کہتا کیا ہے۔ اِس بیچارے نے بغیر اس کے کہ درخواست
کی جائے سنانا شروع کیا کہ دو تین دن شاید ہونگے کہ وہ تینوں، مسلمانوں
کا جو علی گڑھ میں بڑا مدرسہ ہے، وہاں نازل ہوئے اور میاں لڑکے تو ہوتے ہی ہیں
بدشوق، جانے اِن کے کانوں میں کیا پھونک دیا، سب معلمین سے اور سرکار سے
فرنٹ ہو گئے۔ خدا شیخ دانش گاہ ضیاءالدین احمد صاحب بہادر کو خوش رکھے
بھئی ہم تو انھیں کے بھروسے اپنے بچّوں کو بھیجتے ہیں۔ اُنھوں نے جب یہ دیکھا
کہ لونڈے سلیے قابو ہوئے اور ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں، اُٹھا سب کے والدین کو
خط لکھدیا کہ آؤ اپنے بچوں کو سنبھالو، اب ان کی حفاظت میرے بوتلے سے باہر
ہے۔ کل علی گڑہ سے چند سیاہ پوش موری کے بھتنے آئے جو اپنے گھر واپس جانے
تھے اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ سرکار مداخلت کرنے والی ہے اور آگرہ سے
توپ خانہ اور فوج آنے والی ہے۔ میاں آج ایک تار صبح ساڑھے آٹھ بجے آیا کہ
"حالت نازک ہے فوراً آجاؤ"۔ میں حمام میں تھا، گھر میں کہیں کھول کر پڑھ لیا

اور وہاں ایک کہرام مچ گیا، کیونکہ اُن کو توپ خانے اور فوج کے آنے کی خبر ہو چکی
تھی۔ خدا خیر کرے ایک ہی بیٹا ہے، پیروں تلے کی زمین نکلی ہوئی ہے جب سے یہ
سنا ہے۔ سب نے کہا میاں یہ گاڑی تو پنجاب جاتی ہے تمہیں پورب والی میں بیٹھنا تھا،
یہ جو اُنھوں نے سنا تو سن سے زمین نکل گئی، اور یہ دم بھر کو سُن ہو گئے۔ پھر لپک کر
زنجیر کھینچ لی، اس کا مٹھا مضبوط ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے کہ اتنے میں اور مسافروں
نے ہائیں ہائیں کر اُن کی کولی بھر پیچھے سے کھینچنا شروع کیا یہ زنجیر چھوڑیں
نا، اتنے آدمیوں نے جو کی رسّا کشی، زنجیر گئی ٹوٹ، گاڑی تھمی، پیچھے والی
گاڑی میں جو جھنڈی والا کرانی رہتا ہے وہ کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتا ہوا لپکا ہوا
ڈبہ کی طرف آیا، بیچارے شریف آدمی گھبرا گئے نشست کے تختے کے نیچے چھپ گئے
اور سب مسافر دم بخود رہ گئے۔ وہ للکارا کہ گاڑی کس نے روکا، ہر ایک کہنے لگا
کہ صاحب ہم نے نہیں کھینچی، وہ جلدی سے درجے میں گھس آیا اور یہ سب بے چارے
چھپ تختہ کے نیچے سے نکل، پاس تھا پاخانہ، اُس میں دھڑ سے جا پڑے اور جلدی
سے کواڑ بند کر لینے چاہے۔

محلسرائیں
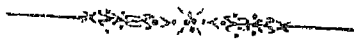
خورشید زمانی منہ ہاتھ دھو کے بیٹھی سر گندھوا رہی تھی، بالوں کے سرے سلجھا چکی تھی - اور کنگھی میں سے بال نکال ان کی گچھی بنا گیسو دانی میں رکھ - کنگھی کو شانہ پیچ میں رکھ رہی تھی - شرف النساء چوٹی میں چار پانچ پیچ دے چکی تھی کہ اتنے میں بی خانم برقعی کے سموسے کو اُلٹے - گھیر کو سمیٹ اور پیچھے سے لپیٹا ہُئیں ہاتھ پر تہ پوشی کے پائینچے کی طرح ڈالے کھسر کھسر کرتی آئیں - آداب کر بیٹھ گئیں خورشید زمانی بیگم نے کہا - شرفن تو کچھ کل کی چوٹی گوندھتی ہیں - آدھی سے زیادہ گوندھ چکی ہے میری جان بے چین ہوئی جاتی ہے - خانم سے کہنے لگیں - بی تم میری چوٹی گوندھ دو - اور شرف النساء سے کہا کہ جا کے مغلانی جی سے کوئی ٹھپے کا ٹکڑا لے آؤ - خانم بولیں - بیگم اب تو تیل گیری بھی چیکٹ ہو گئی کل سے اس کو جھم جھم ڈالنا - خورشید زمانی نے کہا - کہ بی سر گندھواتے وقت اِس سے کام پڑتا ہے - میں روز کہتی ہوں لیکن کچھ عجیب ہیں کہ ذرا ان کو خیال نہیں - ایک اتنا سا سر گوندھنے اور منھ دھلانے کا کام ان کے ذمے ہے - آب چین (تولیا) میں کھولا

تو بدلے جائیں۔ زانو پوش میں بتلاؤں تو اٹھائیں، بھئی پاک اور ناپاک میں میلے بتاؤں تو انھیں نظر آئیں۔ لیکن یہ چاہو کہ انھیں خود کو سجھائی دے یہ ناممکن۔ آپ چین کل ہی بدلوایا ہے۔ نگوڑا برتنوں کی صافی معلوم ہوتا تھا۔ اور ایسی بری بو ہو گئی تھی جانے چھچھوندر پھر گئی تھی کہ میں نے جو منہ ہاتھ پونچھے تو سٹر گئی۔ برا بھلا کہتی گئی اور دوبارہ منہ دھویا۔ ان سے پوچھو سارے دن تم کیا کیا کرتی ہو۔ اب ذرا سے ٹھیے کے ٹکرے کو بھیجا۔ جا کے مر گئیں۔ خدا جانے ان نوکروں نے تو میری عادت کا ناس کر دیا۔ نگوڑے جتنے زیادہ رکھتی ہوں اتنے ہی اور اچھوتی کا ٹکا ہوئے جاتی ہیں نامراد کہیں کے۔ پہلے کام نہ بانٹے تھے تو ایک کی ایک راہ تکتا اور میں گھنٹوں بیٹھی کام کے لیئے چلایا کرتی۔ اب جو کام بانٹ دیئے۔ تو جیسی پوری ڈال رہی ہیں میرا ہی جی جانتا ہے۔ اچھی سشرف! آخر تم کو اور مغلانی جی کو کس نے توشہ خانہ میں پکڑ لیا کہ نگوڑا اتنا سا ٹکرا اب تک نہیں لایا جاتا؟ میری تو بیٹھے بیٹھے گردن دکھ گئی۔ خورشید زمانی کی ساس نے کہا۔ دلھن! آتی ہے نگوڑی۔ تم تو ایک بلی ہیں تین کام چاہتی ہو بیوی! آخر یہ بھی تو اللہ ہی کے بندے ہیں۔ فرق یہی ہے نا کہ اللہ رکھو تم امیر ہو اور یہ غریب تو اس لیئے تھوڑی کہ دل دل مارو۔ ان کی جان کو جان نہ سمجھو۔ خورشید زمانی نے دبی آواز سے کہا۔ اے ہاں تو اماں جان اس کو بھی دیکھئے نا۔ صبح سے میں اسی کی بندھوا ہوئی بیٹھی ہوں۔ دھوپ منڈیر پر تھی۔ اور یہ لیجئے دالان سے یہ آ گئی۔ فقط ایک کام ہے ان کے ذمے اس پر یہ حال ہے

شرف النسأ نے کہا۔ سرکار! خطا میری معاف۔ کام تو ہے ایسا پر کس کا؟ اب تو بڑی
کے دس کام کر لیتی، دو ہی ہاتھ ہیں۔ سہنسرکاں سے لیاؤں۔ کبھی ہل چھوٹا ہوا۔
کبھی کھینچ گیا۔ کبھی لٹ نکل گئی۔ کبھی الٹا ہوا۔ اللہ رکھے تین چار دفعہ کھولی اور
باندھی ہے۔ اِس ترپوں تو انگریز بھی خدمت نہیں لیتا۔ خورشید زمانی کہنے لگی
اے تو پھر کسی فرنگی ہی کی کر لونا۔ شرف النسأ نے کہا۔ وئی اللہ نہ کرے لیچ۔
دُور پار۔ چھائیں پھوئیں۔ یہ شرف تو اللہ نے امیروں اور پڑھے لکھوں ہی کو بخشا ہے
کہ نگوڑے مشرکوں کی ٹہلتے نویسی کریں۔ سرکار! ہم غریب اَن پڑھے جاہل۔ ہما
تو بھوکوں مرتے بھی نہ تھوکیں۔ پر کے سال جاڑے کا ذکر ہے۔ پنجو کی ماں نے کہا
کہ چل انگریز کمبل بانٹتا ہے۔ تجھے بھی دلا لاؤں۔ میں نے کہا کہ کیا ٹھرّے گرہ کا رہے
ہیں۔ بھینسوں پہ راج ڈنڈ، گایوں پہ راج ڈنڈ، ٹھیلوں پہ راج ڈنڈ، اکوں پہ
راج ڈنڈ، ٹکے کی ٹوکری سر پہ لے کر چلو تو تہ بزاری کے نام کا دھروالیں دیچے
کے نام تو موت نہ دیں۔ دینگے اپنا کلیجہ۔ ہمارے گوتک کے تو کوڑے کھڑے کر لیتے
ہیں۔ ہائیں ہم مرے پہ سیدھے کریں یہ دینگے۔ خورشید زمانی بیگم نے جو یہ
سپے در پے گندے گندے نام سُنے بُرا سا مُنہ بنا ایک پھریری لی اور کانوں میں
انگلیاں دے لیں۔ اور کہا لِلّٰہ شرن بس کرو بس۔ اپنے بھاون کے نام اپنے ہی
تک رہنے دو۔ صبح ہی صبح کیا تحفے پیش کیے ہیں۔ سُنتے سے جی متلانے لگا۔ دِقی
تمھیں ذرا گھن نہیں آتی۔ کیا بے تکلفی سے مالا جپتی چلی گئیں۔ ذرا میرا تو خیال کیا

ہوتا۔ شرف النسأ ذرا جھینپ کر بولی۔ کہ ہاں بیگم! قربان گئی تھی جھوٹ تو کہتی نہیں۔
معاف کیجئے گا۔ ہاں تو میں نے اُس سے کہا۔ جائیگی نا۔ تو سٹّلو! بالیاں تک کی
اُتروا لینگے۔ اللہ جانے کوئی للّوئی آئی! اور اس نے قرضے میں یہ دھروائیں۔
ایک دفعہ کا تجھے ذکر سناؤں جمعے کو مرد تو اللہ رکھے مسجد گئے نماز کو۔ میں بھی تو رنجیا لنے
میں۔ چارپائی کھڑی کر چاہتی تھی کہ پنڈا کھنگال۔ جلدی سے اُجلا جوڑا اُتن پہ ڈال لوں
لے تیں گلی میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ کنڈی کھلی وہی ہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی
شربت کے تین لوٹے ڈال گھبرا کے بہن اُٹھ کھڑی ہوئی۔ روپٹے میں کھونچ چربائی
کی لگی۔ کمر بند باندھنے بھی تو نہ پائی تھی کہ نگوڑی ایک للّوئی لال چار خانی کا اُٹنگا لہنگا
سا پھڑکاتی۔ گھنس موئی جوتی بکری کی سی کھرمایں۔ موئے کوڑے کی ٹوکری سر پہ
اوندھائے پکھال کے بیل کی سی کنٹھی گلے میں ڈالے کھٹ پٹ۔ کھٹ پٹ۔ جھٹ
دیتی اندر گھس آئی۔ اور میرا یہ حال کہ تھر تھر تھر تھر کانپوں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے
مولیاں ہو گئے۔ پٹرے پہ سے گرتے گرتے بچی۔ اس نے جو میری طرف
نیلے نیلے دیدے کئے۔ معلوم دیا کہ نیل کی سلائی دونوں دیدوں میں پھیر دی
شہر بربادی کا مزا آ گیا۔ جب کہ فرنگی گھر گھستے روپی لاؤ روپی لاؤ۔ لال بی بی لاؤ
لال بی بی لاؤ! چلّاتے ہو بیٹیوں کو خراب کرتے۔ روپیہ نہ نکلتا تو گھر بھر کا صفایا
کرتے۔ آنکھیں میری بند ہو گئیں۔ اتنے میں اس نے بہت ہی خوش مزاجی سے
کہا کہ بی بی سلام۔ اس نے جو بی بی کہہ مجھے کیا سلام۔ تو ذرا جان میں جان آئی۔

میں نے آداب کیا۔ کہنے لگی۔ بی بی آپ لوگ کا (میں نے اپنے جی میں کہا کہ تم بندہ لوگ کا) پاس اس لیئے آیا ہے۔ ملک کا واسطا برا لڑائی ہو رہا ہے۔ آپ لوگ بی کچھ مدد کرے۔ میں نے کہا کہ ہم غریب آدمی ہمارے پاس کیا رکھا ہے۔ کام کا مندا ہے۔ مرد ہمارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ایک پیسہ نہیں۔ پڑھے لکھے ہو کے لڑتے ہو۔ یہ کس اللہ نے بتایا ہے۔ مُصیبت پڑتی ہے تو ہمارے پاس آتے ہو۔ چین سے بیٹھتے ہو۔ تو ہماری بہو بیٹیاں بھگا لے جاتی ہو۔ اب بیچارے صاحب عالم آج ان کا یہ حال ہے۔ کل تم ہی لوگ ان کی تابعداری کا دم بھرتے تھے۔ ان کی بیٹی کوڑی مس اور بڈھا پادری مل کے بھگا لے گئے، عزت دار آدمی۔ کسی کو مُنھ دکھانے کے قابل نہ رہے چڑھے چاندی کی بات ہے۔ نواب برف والے کی بہو کو ایسا صاف لے گئے۔ نگوڑی کی پوتے دو برس کی بچی۔ دُودھ کو بلوں بلوں کرتی ہے۔ خصم نمانے نے کنوئیں میں گر کے جان دی۔ کیا کرتا شرم دار تھا۔ ماں کے مُرکے میں بچی نہ کچھ کھائے نہ پیئے۔ بڑھیا بڈھے گھر کی ویرانی۔ بچی کی پریشانی سے موئے سے نتتر۔ میری تو سُنا بیگم! ایک بات کا جواب نہ دیا۔ کہنے لگی ڈیکوڑا باڈشا پوٹ پریشان ہے۔ کرور روپا روز اٹھتا ہے۔ ایک ڈن کی لڑائی کا کرچ ہنڈستان بی اٹھا سکے۔ بادشاہ کی پریشانی کا جو میں نے حال سُنا۔ میرا جی بھر آیا کہ آلھی کوڑی کوڑی تک کی سونت سونت لے گئے۔ اور لیئے جاتے ہیں اور بادشاہ کے نام سے۔ کہ ہم ادھی ادھی کو محتاج ہو گئے۔ بی ایمان دیر ہی تو

کھا جاتے ہیں۔ اس بیچارے تک پہنچاتے بھی نہیں۔ بلا کے ہیں نامراد۔ آگی پھوٹا
پھوٹتے نکلے۔ کھٹیا پر پڑ کر کھائیں۔ انہی نمک حراموں نے بادشاہ کو بھی خوب اندر
ہی اندر موسا ہوگا۔ جب تو بیچارا پریشان ہو کے مانگنے کھڑا ہو گیا۔ لنگا رہے
یہاں ہمیں دکھ دیتے ہیں۔ وہاں اسے ستاتے ہیں۔ میرا تو بڑا ہی جی کڑھتا۔ میں نے
سارے گھر کا پیٹ کاٹ کاٹ کے اور سب طرف کاٹ کسر کر کے کوئی چھ سات
برس میں پانچ اگلے دو بیسی (۴۵) روپے جمع کیے تھے۔ میں نے کہا کہ رہے تو
گھر کے بھاڑ میں جھونک جائیں گے تمہارے نوروز کی دلھن کے لیئے ایک نتھ اور
دو دو موتی جوڑ کی بالیاں بنوا لیں۔ کہ پڑی رہیں گی۔ وقت پہ عزت کی چیز ہوگی
تو نکل تو آئے گی۔ میں نے کہا کہ اور تو کیا رکھا ہے۔ وقت نکل جاتا ہے بات رہ جاتی
ہے۔ اپنا بادشاہ ہے۔ وقت سب ہی پر پڑتا ہے۔ ایسی کڑی گھڑی میں ٹالے
بالے بتانے ٹھیک نہیں۔ اندر کوٹھری میں جا۔ صندوق کے پیچھے کے موکھے
میں سے دودھ کا کلھڑ نکالا۔ اس میں ایک ارغ (عرق) کا آبخورہ تھا۔ اس کے
اندر ایک پوٹلی میں باندھ کے ڈال دیا تھا وہ نکال میں باہر لائی۔ دالان میں کھڑی
پٹلیا کھول رہی تھی کہ وہ انگنائی میں سے جھٹ دالان میں آ گئی یہ چیز دیکھ وہ چیز دیکھ
جیسے نگوڑا کوئی ڈاکو گھس آیا۔ میں کھولنے بھی نہ پائی کہ جھٹ دی میرے ہاتھ
سے لے اور جھپ سا نئی کپڑا پھاڑ پھوڑ نتھ اور بالیاں نکال لیں۔ میں نے کہا کہ
آپ ان میں سے دو بالیاں لے لیں۔ میں نے اپنی بہو کے لیئے بنوائی ہیں۔

اپنے بیٹے کی شادی کرونگی - تو اس کی دُلھن کو چڑھاؤنگی - کہنے لگی کہ گہنا کر اب
معلوم ہوتا ہے - ہم کب پہنتے ہیں - ایک ٹوپ کا گولا بیچ کی مڈ میں مسٹری طرف
سے چلنا چاہیئے - اور تُم لوگ ڈیکو بوٹ بوٹ آرام سے لے - ہندستان کا
رَنَیٹ بوٹ اچھا - ولایت کا آدمی بوٹ مارا گیا - ڈیکو برے لاٹ کا جوان
(برو زن خوان) بیٹا اس لڑائی میں مارا گیا - تُم کو باڈشا بوٹ پسند کرتا ہے -
بوٹ موسٹ کرتا ہے - دل کی نرم ہیں سدا سے - میں نے کہا کہ اچھا لی جاؤ
وہ یہ کہہ - تمرا بیرا مربانی - اور طوطے کی طرح گردن مٹکا لے ملبی ہنیؔ - موئی!
جائے گی تو کپڑے تک کے اُتروالیں گے - کمبلوں کا بھلا وا دے کے بلاتے
ہیں - شرف النسا نے جو یہ حال سُنا یا خورشید زمانی بیگم یا تو اس کے اینڈل پیچے
سے کھول رہی تھیں - اور بُرا بھلا کہہ رہی تھیں - اب اس کی باتوں میں سب
کچھ بھول گئیں - اور ایسی محو ہوئیں - کہ امتل گوشت ترکاری کے پیسے لینے آئی
تو منع کر بولیں - کہ دو دنی ہگوڑی جان کھا لی - ایک ہے کہ چڑھا چلا آتا ہے - دوسرا
ہے کہ بلا چلا آتا ہے - ہیں کہ بوٹیاں کھائے جاتے ہیں - میں نے کہہ دیا ہے کہ دور و عن
سے لیے لیا کرو - میری جان نہ کھایا کرو - بات کرتے دیکھ لیں ہر دا ریں - پھر تو
غضب ہے - دنیا زمانے کے کام پھر تو نکلتے چلے آئینگے - دیسے بڑی بیان چترا
کرتی ہیں - امتل بیچاری اپنا سا منہ لے کر جھکی اُٹھ چلی گئی - شرف النسا نے
بدنصیب کا جان جوان کرنیل کا کرنیل بیٹا گزر چکا تھا - ذکر میں جو اس کا نام آیا

گھاؤ کو ٹھیس لگی۔ یاد تازہ ہوئی۔ دل بھر آیا۔ رونے لگی۔ خانم نے سمجھایا۔ خورشید زمانی نے باتوں میں لگایا۔ ہاں تو۔ بی شرفن! تم نے چاروں بالیاں اور نتھ نکال خوب حوالے کی۔ شرفن کہنے لگی اے تو بیگم! میں پھر کرتی کیا؟ میں تو ایسی گنہ گار نہیں تھی کہ اپنے بادشاہ پے وقت آئے اور میں چپکی رہوں۔ اور نہ اب جیسا مرا جب دل تھا۔ جانے تھا تماجی نے کیا سینہ کا کانٹا پھونک کے ڈال دیا ہے۔ مجھ سے تو نا نہ ہو سکی۔ خورشید زمانی بیگم نے پوچھا۔ اچھا تو تمھاری محلے میں اور کس کس سے وہ لے مری؟ بیگم سارے سے محلے والے کا حال تو مجھے معلوم نہیں۔ ان والی ہمسائی کے ہاں گئی۔ وہ بیچاری خود غریبنی۔ واں کیا دھرا تھا؟ کبھی قرنوں کی ایک تانبے کی پتیلی تھی۔ اسی میں بکاتی رہند ھتی تھیں خالی ادھے پہ اوندھی تھی۔ وہ اور ایک ٹوٹا کفگیر۔ یہ اُن کے ہاں سے لیا۔ غرض بیگم! وہ گھر گھر جھانکتی اور کونے کونے کے جالے لیتی پھری۔ مرد نماز سے فارغ ہو کے آئے۔ تو میں نے سارا ذکر سنایا۔ نوروز۔ بسم اللہ کا ثواب اُسے۔ اللہ جنت نصیب کرے بہشتی معصوم تھا۔ کنواری بیٹیاں قربان کی تھیں۔ اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا۔ سُن کے کہنے لگا۔ بی اماں! تم نے تو بیچ لیئے دیا ہی تو بیچے ہیں۔ اس روپے سے گولیاں چلیں گی۔ جانے کتنی ماں کے لال مارے جائینگے؟ ہائے! کیسا رحم دل تھا؟ بیگم! تھا تو وہ بچہ پر بات کہی اس نے سیانوں کی سی۔ مجھ بڑھیا ڈھڈو کی پہلے سمجھ میں نہ آئی

بات گئی گزری ہوئی۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا۔ سمندر کے کنارے ایک ملک ہے۔ وہاں بڑی لڑائی ہو رہی ہے۔ لاکھوں توپیں برابر برابر ایسی چنی ہیں جیسے کالی بکریوں کا پورے کا پورا ریوڑ جگالی کرنے بیٹھ جائے۔ عجیب طرح کے مکان سے ہیں۔ کچھ عمارتیں ایسی ہیں کہ ایک ہی بڑا سا گنبد ہے اور دو اِدھر اُدھر منارے ہیں۔ جانے مسجدیں ہیں یا کیا ہیں۔ اس میں ہزاروں عورتیں۔ بچے کچے۔ گھسے ہوئے ہیں۔ اور ایک چیخ پکار مچ رہی ہے۔ گولے مکان توڑ رہے ہیں۔ مسجدیں سی جو ہیں وہ ٹھنڈی ہو رہی ہیں پھر میں نے دیکھا کہ لڑنے والوں کی ایک ٹولی آئی۔ ان کا لباس کچھ عجیب سا۔ بس فرنگیوں ہی کا سا تھا۔ البتہ ٹوپی کا فرق تھا۔ ورنہ عین مین فرنگی۔ میں سمجھی فرنگیوں کی جو بارہ ٹوپیاں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہو گی۔ مگر بال ان کے کالے تھے اور ہاں بیگم! آنکھیں بھی کالی رنگ انگریزوں کے سے لال نہیں۔ بلکن گورے چٹے سفید۔ ان میں سے ایک جوان سا لڑکا کوئی بائیس تیئیس برس کا۔ یہ مونچھیں جیسے بچھو ڈنک اُٹھائے لڑتا ہوا آگے بڑھا چلا آتا تھا کہ ایک گولا دھائیں سے اس کے پیٹ میں دست بچیریاں لگا۔ اور آر پار ہو گیا۔ وہ کلمہ پڑھتا ہوا گرا۔ اور رخصت ہو گیا۔ اس کی اور بولی تو خاک میری سمجھ میں نہ آئی۔ کلمہ پڑھنے سے جان گئی کہ اے ہے یہ تو مسلمان تھا اور لڑائی مسلمانوں سے ہو رہی ہے۔ اب تو بڑی گھبرائی میں نے چاہا کہ جا کے اُسے سیدھا کروں۔ لیکن اب معلوم ہوا جیسے کسی نے پیر پکڑ لئے

اور ایک قدم اس کی طرف نہ اُٹھ سکا۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ تھوڑی دُور
پر ایک بستی سی ہے آگ کے شعلے بڑے اُٹھ رہے ہیں اور وہ لپٹیں بیگم!
کہ دور دور جاتی ہیں۔ اور آسمان سے باتیں کریں۔ یہ بڑے بڑے کوسلے سے
نیچے پڑے ہوئے بال بھر بھر جل رہے ہیں۔ عورتیں اور بچے انگاروں پر بُری طرح
لوٹ رہے ہیں۔ سنگین کے کچوکوں۔ خون کے فرّاٹوں کے ساتھ گولیوں کی تڑاتڑ
عورتوں کا رونا پیٹنا بچوں کا بلبلانا۔ بڈھوں کا امان مانگنا۔ اذانوں کی گلبانگ
کی گونج۔ اللہ اکبر کے نارے (نعرے) درختوں میں لٹکے ہوئے سفید مقیش
سی ڈاڑھی والے مولویوں اور عالموں کے خر لنٹے۔ بڑی جیز کے ضعیف
ورقوں کے ادھر اُدھر ہوا میں اُڑتے پڑے پھرنے کے پھڑپھڑانے یہ سب
مل ملا کے کچھ عجیب دل دہلانے والی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ ایک جان
جوان لڑکی چھوٹے چھوٹے پھول سے تین بچوں کو ساتھ لیئے ننگے پیر ننگے سر
کپڑے پھٹے کھچے۔ ایک بڑھیا کا ہاتھ پکڑے چلی آتی تھی۔ بڑھیا جگہ جگہ لڑکھڑا لڑکھڑا
کے گری پڑتی تھی۔ تن کے کپڑے جھلسے ہوئے۔ اور اکثر جگہ سے چری ہوئی مودا
لڑکی کی چال میں بھی بڑی گھبراہٹ۔ جب اس شہید لاشے کے پاس آئیں۔
تو معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بڑھیا کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ دونوں دونوں ہاتھوں سے
ٹٹولتی تھی۔ لڑکی نے اس بچے کے جو اس کی گود میں تھا۔ دھڑ سے ایک چیخ
لگائی۔ اور اپنے منہ کو اس شہید لڑکے کے منہ سے ملنے لگی۔ بچے الگ بلک

رہے تھے۔ اس شہید کے پیٹ میں جو گولے سے ایک ہوکھا سا ہو گیا تھا۔ بڑھیا
نے اپنے ہاتھ دونوں اُس میں ڈالے۔ چلو میں لہو بھر اپنے منھ پر ملا۔ اور قبلے کی طرف رُخ
کر اُمّ ہند نہ جانے کیا کہا۔ لیکن میری سمجھ میں ایسا آتا تھا کہ کہہ رہی ہے۔ اے ہندوستان
والی ماں اللہ تجھ سے سمجھے اور تو اپنی آس اولاد کے آگے پائے۔ لڑکی کہہ رہی تھی
اے ہندوستانی سہاگن! جا ٹے تو اپنے سہاگ سے۔ پتھر پڑیں تیرے بھاگ سہاگ
پہ، لُٹ جائے تیرا راج۔ تو نے اپنے بناؤ سنگار کے لیے ریشمی اور اچھے اچھے
کپڑوں کے بدلے روپیہ دیکے دشمنوں کی کمر مضبوط کی۔ اور اپنے مرد کو رجھانے
کے لئے۔ خوب کدیشی مال خریدا۔ الٰہی وہ رِجھنے والے نہ رہیں۔ اور تو چوڑی
مہندی، مِسّی سرمے سے ترسے، تیرے بنت بناؤ دیکھنے والے ملیا میٹ ہو جائیں
اور ایسی تجھ کدیشی مال خریدنے والی پہ ناگہانی غیب سے ٹوٹے کہ یہ سب سُدھ بُدھ
بسر جائے جس طرح تو نے اپنے مردوئے وے کے رسول صلعم کے بدخواہوں کو
سر چڑھایا اور میرے گھر در سرتاج کو مجھ سے چھڑایا۔ اس سے زیادہ تیرا خراب
ہو۔ موئی کافرنی! گندے منھ سے کلمہ پڑھنے والی۔ نامُراد اُجڑ جائے تیری مانگ
تو نے خوب خوب اسلام کی جڑ اُکھاڑنی چاہی ہے۔ اور اپنے مردوں کو رسولِ خدا
کے دشمنوں سے میل رکھنے دیتی ہے۔ اور اُن کی دوستی پر فخر کرتی ہے۔ ڈھے جائے
تجھ ناشاد کا مان اور زور! اسی کو تو ایمان سمجھتی ہے کہ خانہ خدا پہ گولے برسیں
غلاف خانہ کعبہ کا جلے۔ اور محبوبِ خدا کا مزار لرزے۔ پیران پیر دستگیر کے مزار

کی بے حرمتی ہو۔ قرآن کی جھڑیاں اڑائی جائیں۔ عالموں کو سولی دی جائے۔
کربلا میں دوبارہ کربلا ہو۔ ہمارے بچے نصرانی بنائے جائیں۔ ہماری بچیوں کی عصمت
دری ہو۔ خانقاہوں میں خون بہیں اور تو اپنے امن کی خیر منائے۔ اور ایسے
مردوں کو جو دشمن سے میل ملاپ رکھتے ہوں اور کسی نہ کسی صورت سے مدد پہنچاتے
ہوں۔ منہ لگائے۔ تف ہے۔ تجھ ناشادنی پہ!۔ کاش کہ تیری ماں تیری جگہ پتھر جنتی
جو کسی موری کے کام تو آتا۔ مردوں کی ایمان فروشی اور دشمن سے میل جول تیرا
اپنا قصور ہے۔ اگر تو ایسے منافقوں اور دنیا کے کتوں کو دھتکار کے پاس نہ بٹھاتی
بلکہ ان سے بات کرنے میں اپنے ایمان کا خلل خیال کرتی تو ان کی مجال یہ نہ ہوتی کہ
اسلام کا خرابہ کرتے۔ اور اپنا گھر بھرنے اور اپنی عزت بنانے کو اسلام کا گھر اور
اسلام کی ناموس بگاڑتے۔ تو خوب کدلیشی مال خریدا اور دشمنوں کے ملک اور مقبوضوں
میں امن قائم رکھوا کر اسلامی سلطنتوں کو اجڑوا۔ اور رسول کے گھر میں اور پاک
مقدس مقاموں میں بدامنی پھیلوا۔ تجھ پر خدا کا قہر ٹوٹے اللہ کا غضب نازل ہو
اور رسول کی شفاعت سے محروم ہو! اور جانے کیا کیا کہا کہ اکا ایکی نور سا تمام آسمان
پر پھیل گیا۔ اور غل مچ گیا۔ شہید شہید۔ اب جو میں نے دیکھا تو وہ لڑکا تو پردار
گھوڑے پر سوار دولہا بنا آسمان ہوا کو چلا جاتا ہے۔ بڑھیا وہ لڑکی اور تینوں بچے بڑی
کلیجہ پھاڑنے والی آوازیں نکال رہے تھے کہ چند جوان جوان دینگے سے فرنگی
گھوڑے کدلاتے اس لڑکی کے پاس آئے۔ لڑکی لاش سے لپٹی پیٹ رہی تھی۔

اسے خبر تک نہ ہوئی۔ ان نگوڑوں نے کود لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ اور سور کھانے
نے اس مومنہ کے منہ کی طرف اپنا گندا منہ بڑھایا۔ لڑکی ایسی نازک کامنی کہ کیا
بتاؤں۔ ان مردودوں کے ہاتھ لگاتے ہی وہ تو شیرنی کی طرح بھر پڑی۔ گود کا بچہ جو
ابتک ماں سے سہما ہوا لپٹا تھا۔ اس کو زمین پر پٹخ مقابلے کے لیئے تیار ہو گئی۔
ہتھیار تو کیا پاس تھا گھونسا تان کر ان حرام خوروں پر گری۔ وہ بدمعاش ہنستے رہے
آخر ایک نے معلوم نہیں اس لڑکی سے کیا کہا۔ کہ لڑکی نے اچھل کر ایک طمانچہ
اس مردار کے منہ پر رسید کیا۔ جس سے وہ چکرایا اور پاؤں ڈگمگائے۔ پھر اسی
سنگدل نے کیا کیا کہ بیچاری کے ننھے سے بچے کو زمین پر سے اٹھا جھونجھل میں آ
پکڑ دونوں ٹانگیں اور پھر ادھائیں سے دے مارا۔ وہ چھرچھریاں سی لیں اور ایک
سسکی بھر وہ چل بسا۔ اس بدنصیب لڑکی نے اس ظلمی پر پھر وار کیا۔ لیکن کہاں عورت
کہاں مرد! بیچاری کو بڑی بے دردی سے زمین پر دے پٹخا۔ بڑھیا جو دو بچوں کو
سمیٹے بیٹھی رو پیٹ رہی تھی۔ اس ہنگامے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پاس پڑا تھا لڑکے
کا یہ بڑا سا چھرا۔ اسے جلدی سے اٹھا اس ناری پر جا پڑی۔ اور ایک ہی وار میں
اس کی پتلی سی گردن الگ جا پڑی۔ اس پر دو چار نامرد گھوڑوں سے کود پڑے
اور اس بڑھیا اور لڑکی کو گھیر لیا۔ بڑھیا پر گھوڑوں کو ریل دیا۔ وہ دکھیارن ندن میں
آن گر پڑی۔ گھوڑے کی ٹاپ سے بیچاری کی ساری کھوپڑی چپکا چور ہو گئی۔ سفید سفید
خون میں لتھڑا ہوا بھیجا بھوؤں پر آن پڑا۔ اور بھیں ٹاپ کی ضرب سے مع کھال اور

گوشت کے بالکل اُڑ گئیں۔ جبڑے کی ہڈی ٹوٹ کے گال کی کھال چیر باہر نکل پڑی۔ ایک ظالم نے گھوڑے ہی پر سے گولی چلائی وہ ایک بچے کی کنپٹی میں لگی۔ بیچارا اللہ میاں پاس سدھارا۔ ماں پوا توں کی طرح ان موذیوں سے اپنے آپ کو بچا رہی تھی۔ پانچ چھ سنگینیں کھا وہ بھی گر پڑی۔ رہ گیا چار ساڑھے چار کا بچہ۔ اُسے ناشاد اُٹھا گھوڑے پر ڈال ہنستے ہوئے چلتے بنے۔ بڑھیا پڑی سسک رہی تھی۔ میں ڈرتے ڈرتے اُس کے پاس آئی۔ جوں ہی میں نے آپنے چھوا لڑکی جو مردہ سی پڑی تھی۔ دم توڑنے کے لئے تڑپی اور تڑپتے تڑپتے اُس جوان لڑکے کی لاش پاس پہنچی۔ ہاتھ کھینچتے اور پھیلتے۔ منہ سے اللہ اور محمد نکل رہا تھا۔ لیکن سنگین جو گلے پہ بیٹھی تھی۔ تو خون منہ سے ڈھل ڈھل بہ رہا تھا اور محمد اُس میں اٹک کر رہ جاتا۔ میرا مارے ڈر کے یہ حال تھا کہ نہ اپنے آپ کو زمین پر پاتی تھی نہ آسمان پر۔ میں بڑھیا کی طرف جھکی تو اُس نے اس بُری طرح سے مجھے دیکھا اور کہا کہ ناس پیٹی! آگ لگا پانی کو دوڑنے والی! دوزخ کی کندا دور ہو یہاں سے۔ بیگم! میں اُچھل پڑی اور اسی گھبراہٹ میں میری آنکھ کھل گئی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ابھی جمی ہو گئی۔ صبح اُٹھی نماز پڑھی وہم کے مارے کسی سے خاب (خواب) نہ کہا سارے دن جی اُڑا اُڑا سا رہا۔ نوردز کے ابا ٹھیوں پہ اٹو کیا کرتے تھے۔ بیگم! گوٹے کناری کا رواج نہ رہا بیویاں لگیں ولایتی بیلیں فیتے لگانے۔ کام کا مندا ہوا۔

بچارے بہشتی پریشان پریشان تھے۔ میں نے پوچھا۔ کیوں! کیا آج کام نہیں آیا؟ کہنے لگے۔ کچھ پسلی میں کسک ہے۔ میں نے کہا کہ بارہ سنگھے کا سینگ گھسے دیتی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو دم بھر میں آرام ہوئے جاتا ہے۔ اور نہیں تو موم کی ایک گولی نگل لو۔ ایک پر ایک (تجربۂ تیر بہدف) ہے درد کھڑا تو رہیگا نہیں موم کی گولی بھی کھلائی۔ ایلوے کی گولی بھی نگلوائی۔ لیکن درد تو بڑھتا ہی چلا گیا الٰہی کیا کروں۔ بڑے حکیم صاحب (مسیح الملک حافظ حکیم اجمل خاں بہادر) تو کوئی نگوڑی قوم نکل آئی ہے۔ اس کے پیچھے دشمن دیوانے ہیں کہ جہاں اس نی جھونٹوں بلایا اور یہ سنّجوں چلد ئیے۔ جانے بیگم! کونسی یہ امیرزادی ہے۔ کوئی بیٹرانی یا کسی ریاست کی بیگم ہے۔ یہ تو تال بھوپال والی سے بھی بڑھ گئی۔ ان کے بلانے سنے تو حکیم صاحب اتنا جاتے بھی نہ تھے۔ اور اس کے تو اشارے پہ دوڑتے ہیں۔ اور ہے نگوڑی سدا کی مرضین۔ آئے دن کی روگی۔ کمبخت مر بھی تو نہیں چکتی جو جھگڑا چکے۔ اور حکیم صاحب شہر میں رہیں۔ ہر وقت اسی کی نبض پہ ہاتھ رہتا ہے ایسا جانے کونسا نہال کر دیتی ہوگی۔ جاتے تو وہاں بہت ہیں۔ پر بیگم پیسے کی بافت تو اس کے ہاں سے ہے نہیں۔ کوئی ہے نگوڑی بڑی دانہ زدہ۔ رامپور والے نواب کے ہاں جاتے تھے تو ہزاروں روپے لاتے تھے۔ اب تو سننے میں آیا ہے کہ باہر کے نذرانوں کی آمدنی بالکل نہیں رہی۔ بس جائداد کا کرایہ سمجھ لو۔ جانے کونسی مُہر کی اس نے حکیم صاحب پر ڈالی ہے کہ اس کے پھندے میں

آ گئے ہیں۔ اور زرا روپیے کی آمد کا خیال نہیں رہا۔ اوّل تو شہر میں ٹکتے ہی کون سے ہیں۔ اگر ایک آدھ دن کو آئے۔ تو ان روز روز کے جلسوں کی الجھاؤ میں ایسے رہتے ہیں کہ انھیں کسی کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ وہ تو شہر میں جمی جمی بھی اب بلاؤں کسے اور کون مجھ غریب کے بلائے سے آئے۔ کسی انگریز کو بلاتی تو پہلے سولہ روپیے بھینٹ کے رکھ لیتی۔ خیر صبح تک کچھ بھی نہ تھا۔ اتنا کہا کہ تنفرقا کے آنسو بہنے لگے۔ بیگم ایک بچہ میرا نور روز وہ کیا کرے۔ اس نے کب کسی کا فرمان دیکھا تھا۔ اللہ محلے والوں کا بھلا کرے۔ انھوں نے بڑا ہاتھ بٹایا۔ اوّل منزل گر آئے۔ بچے نے بڑی بیٹیاں کھائیں۔ اور رشتے رشتے جان ہلکان کر لی۔ پھولوں والے دن کہنے لگا۔ اماں میرے پیٹ میں بڑی دُکھن ہے۔ میں نے جو یہ سُنا۔ سن سے زمین پیروں تلے کی نکل گئی خواب یاد آیا۔ اس کی تسلّی کو بات بنا دی کہ بیٹا کوئی بات نہیں۔ اونچا نیچا پاؤں پڑ گیا ہوگا۔ ناف ادھر اُدھر سرک گئی ہوگی۔ اینٹ گرم کرکے اور کپڑے میں لپیٹ پیٹ خوب سینکا لیکن بچے کو ذرا فائدہ نہ ہوا۔ دو تین دن میں تو یہ حال ہوا کہ کھٹیا سے لگ گیا اُٹھنا بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ میں نے اودان کاٹ نیچے جھکرا رکھ دیا۔ کوڑی گھر میں خرچ کو نہ رہی۔ ماندگی کا یہ حال روپے کی یہ کشش پہلے جو برتن تھے وہ بیچے ان کے داموں سے چند دن کاٹے۔ پھر جو اوڑھنے اوڑھانے کا گدڑ گودڑا تھا وہ بیچا جب کچھ نہ رہا تو بڑی تنگ آئی۔ انارو والی ہمسائی کے ہاں سے آٹا قرض لینے گئی

ان بیچاری کے ہاں پہلے ہی سارے گھر میں جھاڑو دل چکی تھی۔ میاں کسی انگریز کا خدمت گار تھا۔ اُس نے الگ کیا۔ ماندا ہوا۔ مرگیا۔ اور چار او پر بیس بیاز دہ نہ روپے قرضے کے چھوڑ گیا۔ وہ بیچاری خود ہاتھ پہ ہاتھ دہرے چولھا اوندھائے بیٹھی تھی۔ ہم دونوں جنیاں اپنی مُصیبت یہ رونے لگیں۔ وہ بولی کہ دیکھو بہن! جس دن سے میں نے ہتیلی دی خداجانے گھر سے رزق ہی اُٹھ گیا۔ یہ معلوم ہوتا ہو کہ کوئی جھاڑ کرنے گیا۔ بڑی خرچ کی تنگی ہی۔ چل اُسی کے پاس چلیں شاید وہ ہم دونوں کا دو دو روپیہ مہینہ کرا دے۔ کشمیری دروازے کے باہر رہتی ہی۔ میں نے کہا کہ بوا میرے پاس تو برقعہ بھی نہیں کہ سر پر ڈال کر تیرے ساتھ چلوں۔ ہم نے اُن کے وقت پہ اُن کی مدد کی۔ اب ہماری مدد وہ کریں اگرچہ سب سے بڑا مدد کرنے والا تو اپنا اللہ ہی۔ لے ہے برقعہ کہاں سے لاؤں۔ وہ بیچاری بولی کہ رجّو (رضیہ) کی ماں سے مانگ لائے دیتی ہوں۔ پھر ہم دونوں چلیں گے دوپہر کا وقت بھی ہو۔ ایسے میں سوفتہ ہی۔ رستے میں بہت چھیڑ دبر فرنگ کھریہ بائے معروف) ہوگی۔ اپنے چپکے سے نکل چلیں گے۔ غرض ہم دونو سود بناتے اُس کی کوٹھی ڈھونڈتے ڈھانڈتے پہنچے۔ کوئی دو تین گھنٹے میں جاکے کہیں ملی۔ اندر حاطے میں گھسے۔ پہلے تو دو آدمیوں نے روکا۔ موئے بلا کی طرح لپٹ گئے۔ لیکن اتفاق کی بات کہ وہ سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی کچھ لمبے لمبے تکلوں سے مچھلی کا جال سا بنا رہی تھی۔ ہم پہنچے۔ سلام کیا۔ نگوڑی لفندری ایسی بددید

ہو گئی - جیسے ان تلوں تیل ہی نہ تھا - ایسی بے رُخی سے کہا - کیا مانگتا ہے - میں نے
ڈرتے ڈرتے اپنا حال کہا - انارو الی ہمسائی بولیں - ہم بہت غریب ہیں بیغمبری
وخت پڑا ہے - موئی مطلب کی یار - کہنے لگی - کہ تُم فرڈ دری کرد - ٹوکری اُٹھاؤ ہم تجھ
نہیں ڈیگا - میں نے کہا کہ میں نے تو سونے کی چار بالیاں اور نتھ دی تھی - اسی کا
کچھ عیوض سمجھ کے دیدو - اے بیگم! وہ تو سُن نگوڑی ایسی لپک کے اُٹھی جیسے
کھا ہی جائیگی - دو نو مٹھیوں کے گھونسے سے بنا - کچھ اس طرح سے گھٹوں کو اونچا
نیچا کیا اور مُنھ ایسا لال ہو گیا - جیسے پُرانی بندریا کے . . . . . میری طرف
دیکھتی جائے اور ایسے لمبے لمبے سانس لے کہ ایک ہی سانس میں ساری بیری کو اندر
سٹک جائیگی اور کھال کی دھونکنی کی طرح پھولے اور سکڑے - پھر جو وہ گرج کے بولی
ہے - یاں تجھ نہیں ملتا - ابی چلے جاؤ - ہم دونو اپنا سا مُنھ لے کر کھسیانے کھسیانے
پلٹے - کہ اتنی دُور کی کھکیڑ بھی اُٹھائی اور نہ کچھ حاصل نہ وصول - ششّا کا خصم گھانس
پہ لوٹ رہا تھا - ہم دو نو کو دیکھ ہماری طرف لپکا - میں بھاگوں بھاگوں کہ اتنے میں اس
نے تو رضیہ کی ماں کے برقعے کی لیریاں اُڑا دیں - میں برقا (برقعہ) بچاؤں بچاؤں
اُس نے میری پنڈلی کی بوٹی کی بوٹی الگ کر دی - میں بلبلا گئی - ساری ٹانگ لہو
لُہان ہو گئی - اِس خندی کے نوکروں نے اس کے باوا کو تو آن کے پکڑا - اور
میں گرتی پڑتی بھاگی - بیچاری انارو الی ہمسائی ایسی گھبرائیں کہ کونڈی میں جا پڑیں
ساری وہ بھی نجس پانی میں لت پت ہو گئیں - نماز کپڑے سب خراب ہو گئے -

ہم دونوں اپنے یہ دھاڑے بنا روتے پیٹتے پلٹے۔ ڈر کے مارے۔ میں نے جب
نکلی ہوں تو پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ کہ وہ نامراد پھر آن کے ٹانگ نہ لے۔ کیا دیکھتی ہوں
موئی کتّوں گھیری۔ اس کا مُنھ اپنے مُنھ سے چوم رہی ہے۔ ہنستی جاتی ہے اور ایک
ہاتھ سے اُس کی کمر تھپکتی جاتی ہے۔ رستہ اجیرن ہو گیا۔ اللہ بھلا کرے ایک آدمی
کا اُس نے نل پر سے پانی لے کر میرا ہاتھ دھلایا۔ اپنا صافہ پھاڑ پٹی باندھی۔ اور
کہا مائی صبر کر۔ میں نے پوچھا بیٹا تو کون ہے۔ تیری ماں کی ممتا ٹھنڈی رہے۔ کہنے
لگا میرا نام شنکر لال ہے۔ اور کانگرس کا معتمد ہوں یہ دوسرا بھائی سیوا سمتی کا ہے
اماں تمھارے گھر تک پہنچا آئیگا۔ تم رو دُو مت۔ انار والی ہمسائی کو پوچھا یہ کون
ہیں ماں! میں نے کہا بیٹا شہر آبادی میں ان کی حکومت ہی تھی۔ جب شہر اُجڑا تو
اِن کا خاوند نو برس کا تھا۔ اُس کو ایک فوجی افسر پکڑ لے گیا۔ اپنی خدمت گاری
میں رکھا۔ حال ہی میں بیچارے کا انتقال ہوا ہے۔ یہ دُکھیا رانڈ ہے۔ میرے ساتھ
آ گئی تھی۔ بیچارے سے نے روپیہ روپیہ ہم دونو کو دیا۔ بہتیرا ہم نے انکار کیا۔ نہ مانا
اور گلی تک ساتھ آیا۔ جانے بیوی یہ کون ہیں۔ ہیں تو ہندو۔ لیکن رحمت کے فرشتے
ہیں۔ چراغوں تک گھر آئی۔ بچّے کی حالت خراب پائی۔ پیٹ میں پھوڑا تھا۔ مچھلی
کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ساری رات اس کی پٹّی پکڑے بیٹھی رہی۔ ایک تو اِس کی
پریشانی یا دوسرے پیر کی تکلیف۔ نیند کیسے آتی۔ پھر خیال کہ لے ہے۔ برقعہ بڑا
تھا۔ وہ پھٹ گیا۔ اب کہاں سے ڈھونڈھونگی۔ ساری رات سُولی پہ کٹی۔ صبح ہوتے

وہ پھوڑا پھوٹا۔ سیروں مواد نکلا۔ پوچھتے پوچھتے باؤلی ہوگئی۔ پھر کے زخم میں بڑی طرح کی چرمراہٹ۔ لال مرچیں بھریں آگ لگ گئی۔ اُدھر اس کا دُکھ اِدھر بچے کی تکلیف کوڑھ میں کھاج۔ سارے گھر کا گڑ گودڑ سب پراد پوچھنے کے کام آیا۔ ایک چیتھڑ بھی دیکھنے تک کو نہ رہی۔ میں نے مجبوراً اپنا کرتا پھاڑ بچے کے کام میں لیا۔ سارے دن ساری رات ایک دوپٹے میں لپٹی رہتی۔ جاڑے شروع ہوگئے تھے۔ رات کو خاصی ٹھنڈ ہوجاتی۔ دوپٹے میں کیا خاک سردی بجاگتی۔ اکڑ سکڑ کر رات کاٹتی آخر دوپٹہ جب بچے کو سردی معلوم ہوئی تو اس پر ڈال دیا۔ وہ سارا پیپ راد میں لس لس ہوگیا۔ اب ایک دھجی تن پہ ڈالنے کو نہ رہی۔ سارے دن اس غیرت کو کہ ایسے ہی کوئی محلے والی آئی تو کیا دیکھے گی۔ کنڈی لگائے رہتی۔ بیچاری انار والی ہمسائی پاس کیا دھرا تھا۔ جو اُن سے لیتی۔ اپنے آپ ایک دن ایک پرانا کرتہ دوپٹہ دے گئیں۔ اس سے میں نے اپنا تن ڈھنکا۔ دوپٹہ تو پھر بچے کے سنگ لگا۔ کرتہ گلے میں پڑا رہ گیا۔ اس عرصہ میں میری پنڈلی بھی پک گئی۔ سخت کھولن اور جلن۔ ایسی لپک اور چمک کہ توبہ۔ مجھے بخار چڑھ آیا۔ اور لوتھ ہوکے پڑگئی میں نے پھڑک کر دعا مانگی۔ اے اللہ میری مشکل آسان کر۔ اسی غفلت میں میری آنکھ جھپک گئی۔ تو کیا دیکھتی ہوں کہ ہمارے نبی جی ہیں۔ آپ کے دو نو نواسے اور چاروں خلیفہ ساتھ ہیں اور پیچھے پیچھے حضرت بوی زار و قطار روتی ہوئی ساتھ ساتھ چلی آتی ہیں۔ ایک بڑا سارا میدان ہے۔ اس میں دور سے ایک عالی شان مسجد

نظر آتی تھی۔ ہزاروں کی لاشیں خاک اور خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔ کچھ دم توڑ رہے تھے کچھ توڑ چکے تھے۔ ہمارے حضور اور آپ کے سب ساتھی بڑے پریشان اور اداس اداس۔ آنکھوں میں آنسو بھرے۔ چاند سے چہرے خاک سے اٹے ننگے سر۔ ننگے پیر۔ عمامے گلوں میں پڑے۔ چاروں طرف ایک رعب کا عالم آسمان زمین پر چھا جوں نور برس رہا۔ ہمارے رسول کریم کا رنگ گیہواں، بڑا تیکھا نقشہ کاکلیں شانوں پر پڑی۔ لیکن گرد اباد۔ آنسو بہہ کر ریش مبارک پر آتے تمام لباس سرکار دو عالم کا خون میں چھینٹم چھینٹ۔ لاشوں کو الٹاتے۔ چھاتی سے لگاتے اور دھارم دھار روتے۔ آپ کے ساتھی پرسا دیتے۔ مولا مشکل کشا۔ مدرا قد۔ بھاری ڈیل۔ بہت شکیل۔ ایک پیالہ ہاتھ میں۔ حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ دائیں بائیں۔ سبز پوش۔ بے حد جمیل۔ ہاتھوں میں صراحیاں۔ غم کے مارے ہاتھ لرزتے۔ حضرت بیوی نقاب ڈالے۔ بڑی والی وارث لڑکیوں کی فوج ساتھ لیئے، رانڈوں بیواؤں کو پرسا دیتی جاتیں اور دونو صاحبزادے صراحیوں میں سے انڈیل کر ایک انوکھی چیز سی پیالے میں ڈالتے۔ حضرت علی بڑے ادب سے ہمارے رسول اکرمؐ کے حضور میں پیالہ پیش کرتے۔ آپ روتے ہوئے اسی پیالے کو لے کر دم توڑتی ہوئی لاش کے پاس جاتے۔ وہ فوراً دیکھ اٹھ بیٹھتی اور کچھ کہتی۔ مجھے یہ دو بول یاد رہ گئے "لبیک روحی فداک یا رسول اللہ" اس کے بعد جان کنی کی تکلیف بالکل نہ رہتی۔ ایک براق آتا۔ اس پر وہ سوار ہو غائب ہو جاتا۔

اگر ان سسکتے ہوؤں میں سے کوئی اپنے گھر بار کی بربادی کا گلہ کرتا تو آپ بڑی دلجوئی فرماتے اور کہتے اے میرے دین کی حمایت میں جان و مال سے لڑنے والے میرے مزار اور خدا کے گھر کی حفاظت میں جان دینے والے، میرے خلیفاؤں کی عظمت اور آن پر مٹنے والے! صبر کر تیرا بڑا رتبہ ہے۔ خاتونِ جنت فرمائیں کہ اے میرے بابا جان کے لاڈلے! میری طرف خیال کر، تیری خاطر لختِ جگر قربان کیئے۔ میرے لال تین دن کی بھوک پیاس اُٹھا کر کس طرح شہید ہوئے۔ یہ صرف حق کی حمایت تھی۔ کہ میرا بیمار بیٹا۔ رسیّوں میں بندھ کر گھسٹا۔ میرے گھر کی رونقیں کس طرح شہر بشہر ننگے سر پھرائی گئیں۔ جو حق کا ساتھ دیتا ہے اور تکلیف اُٹھاتا ہے اُس کا حشر میرے ساتھ ہوگا۔ اِس کے اعمالوں (اعمال) کا جواب میں دونگی۔ تیرے پس ماندوں کا والی مولیٰ ہے۔ یہ ایمان اور حق کی آزمائش کا وقت ہے۔ مُبارک ہو تجھ کو کہ تو پورا اُترا۔ دیکھ نظر اوپر اُٹھا۔ جنت کے دروازے تیرے لیئے کھلے ہیں۔ اور حُوریں تیری منتظر ہیں۔ وہ موتی کا محل تیرا ہی ہے۔ یہ سُن کر اُس کی جان اس طرح نکل جاتی جیسے پنجرے کی قید سے جنگلی توتا۔ میں ہمّت کر کے آگے بڑھی اور عرض کی حضور میری مُصیبت دُور کریں۔ فرمایا۔ خدا کا گھر ڈھوانے اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے گولے لگوانے کو سونا دے۔ میں گڑگڑائی اور کہا۔ کہ کیا کریں ہم مجبور ہیں۔ اِن کی حکومت میں ہیں۔ علاقے کے رُکن آتے ہیں! ورنہ ہم سہم جاتے ہیں۔ کہنے لگے۔ پھر اُن ہی کی حکومت میں رہ یہاں مانگنے سے کیا واسطہ۔

کہ ایکا ایکی وہی جوان سی لڑکی نمودار ہوئی۔ جسے پہلے خواب میں دیکھ چکی تھی۔ زخموں سے چور چور ایک بچّے کی لاش کمر سے باندھے۔ دوسری ہاتھ میں اُٹھائے۔ چلی آتی ہے۔ بڑھیا جس کا سر گھوڑوں کی ٹاپوں سے نصرانیوں نے چکنا چور کر دیا تھا اس کی عجیب طرح کی صورت ہو گئی تھی۔ چاروں طرف فرشتوں کا جھرمٹ تھا۔ مجھے دیکھ وہ بڑھیا چلّائی کہ یہی میرے گھرانے کی تباہی کا باعث ہے۔ خدایا داد ہے فریاد ہے! میں اپنے انصاف کو پہنچوں۔ وہ لڑکی بولی۔ اسی نے میرا بھرا بھتولا گھر خالی کرایا ہے۔ اور اسی کے ملک کے مولوی مفتیوں نے اپنے بچاؤ کے لیے اسلام کی حمایت سے رو گردانی کی ہے۔ اور اپنے آپ کو مسلمان، امن پسند، ایمان دار بتاتے ہیں۔ میرے ایک بچّے کو نصرانی پکڑ لے گئے ہیں۔ یہ دو میرے ساتھ ہیں سینکڑوں مسلمان لڑکیاں اور بچّے نصرانی بنائے گئے۔ لیکن اس کے ملک کے مولویوں اور مفتیوں نے دم نہ مارا۔ ہاں امن قائم رکھنے کی آڑ میں دنیا کماتے ہیں۔ اور ملک میں پھوٹ ڈلوانی چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے ان باتوں سے کیا مطلب۔ ان کی کرنی ان کے ساتھ۔ میں نے جو دیا۔ وہ اس نیت سے نہ تھا۔ مجبوری تھی۔ میرا خدا جانتا ہے۔ یاحضرت آپ دونو عالموں کی رحمت ہیں۔ فرمایا۔ اگر یہ نہ ہوتا۔ تو تم سب کے چہرے مثل بندروں کے اور بد جانوروں کے ہو گئے ہوتے۔ میں ذرا ہوشیار ہوئی اور دل کی عجیب نوبت تھی۔ اسی حالت میں ایک آواز صاف سنائی دی۔ کہ ہاں فرنگیوں کا مال خریدیں ہندوستانی عورتیں اور پہنیں فرنگستان

کا کپڑا۔ جتنا ہندوستان میں ململ اور تن سکھ، لانگ کلاتھ، لٹھا، چھلواری ہے سب کفنوں میں لگیگا۔ ایک وبا نازل کیجائیگی جس میں لاکھوں عورتیں رانڈ ہونگی کروڑوں بچے یتیم ہوجائینگے۔ اور ہزاروں گھرانے ایسے ہوجائینگے کہ جہاں کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں رہیگا۔ صدہا ماں باپ اولاد کا داغ دیکھیں گے۔ کیونکہ اُنھوں نے دنیا کے لالچ اور طمع سے حکمِ ربّانی کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا۔ لوگ شہرت پسندی، حرص اور خودغرضی میں گرفتار ہیں۔ مذہب سے غافل ہیں۔ شراب خواری کی کثرت ہے۔ قرآن شریف کی حُرمت کم رہ گئی۔ سودخواری مذہب کی آڑ میں جائز کردی ہے۔ شرم وحیا اُڑ گئی۔ کلام اللہ پر اعتراض ہوتے ہیں۔ عورتیں ولائتی سلمیں تھپے شوق سے لگائیں ہم اُن کے دلوں کو غم لگائینگے۔ جنہیں شوق سے ولائتی کپڑا اُنھیں رنڈسالے پہنائے جائینگے۔ اس وبا کی آمد کی نشانی یہ ہوگی کہ دلّی میں کوڑھ کی بیماری بہت پھیلے گی۔ اور روز ایک آدھ کوڑی بازاروں میں پھرتا مل جایا کریگا۔ اور پھر اس کی تعداد بڑھنی شروع ہوجائے گی۔ اللہ کے گھر کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا، تم نے نہ مانا تو۔ اب اپنے گھروں کو بچاؤ جہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ خدا کی راہ میں مت لڑو۔ کیونکہ مرجاؤ گے۔ اور اب ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ بیگم! یہ آواز ایسی صاف سنائی دی کہ میں ڈر گئی۔ اور گھبرا کے آنکھیں پھاڑ اُٹھ بیٹھی دیکھا کہ انار والی ہمسائی اپنے آنچل میں سے پٹی پھاڑ۔ بچے کے ڈھاٹا باندھ رہی ہیں۔ انگوٹھے باندھ چکی ہیں۔ بس دنیا اندھیر ہوگئی۔ جو حال ہوا۔ بیان سے باہر ہے۔ یہ کہہ

پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ خانم اور خورشید زمانی نے تسلّی دی۔ شرفاً کہنے لگی کہ بیگم! اس دن سے میں نے تو کوئی چیز آج تک فرنگی کے ہاتھ کی لی نہیں۔ کمبل بنتے تھے۔ سردی میں اکڑ ہی لیکن نہ لیئے۔ غریبی میں میرا یہ حال ہے۔ امیر جانے ہو تی سا کیوں تی (خلعت) لے آتے ہیں۔ ان کے دل میں ذرا خوفِ خدا نہیں۔ ہم چاہیں تو کمبل کا خلعت ہم بھی لے لیا کریں۔ لیکن بیگم! دل لرزتا ہے۔ کہ اے ہے بدن سے لگا اور کوڑھ چڑھی۔ خطاب لیا اور کوئی مخاطب کرنے والا نہ رہا۔ نسل تک کی غارت ہو جائیگی۔ اسمار سے بڑے حکیم صاحب نے اپنا خطاب لوٹا دیا۔ اور آصف علی میاں ڈاکٹر انصاری اور سب بڑے بڑوں نے کدیشی مال جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ نواب محسن الملک کے چھوٹے بھائی سید امیر حسن کا سارے کا سارا گھرانا کیا مرد کیا عورت سب گاڑھا پہننے لگے۔ اور سارے کپڑے جلا ڈالے۔ کان گنہگار رہیں۔ کہتے ہیں کہ اس میں مہاتما جی کی چال ہے کہ مسلمانوں کے پاس اودھر اہی کیا ہے سوائے چار لتے چلے چیتھڑوں کے۔ ایسی ترکیب نکالو کہ چار انگل کی لنگوٹی کو ترسیں اور ننگے نہ آئے۔ بیوی! یہ بات مجھے بڑے تحصیلدار صاحب نے سمجھائی ہے۔ اور وہ بڑے صاحب سے سن کر آئے سے کہتے۔
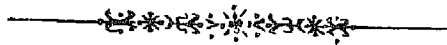
ماپلا جس کو انگریزی میں موپلہ کہتے ہیں اور ملایالم میں ماپ پلا ایک قوم ہے جو مالابار میں آباد ہے۔ زبان اسکی ملایالم ہے جس میں دراوڑی عنصر کے ساتھ سنسکرت اور عربی کے بہت سے الفاظ کا میل ہے۔ جو ہندوستان کے جنوب ترین حصے میں بولی جاتی ہے۔ مذہبی کتابیں عربی ہی میں پڑھائی جاتی ہیں۔ پیشہ ان کا تجارت کشتی رانی۔ مچھلی کا شکار زراعت اور چھوٹا موٹا کاروبار ہے۔ مذہب ان بدنصیبوں کا مصیبت کی علامت اسلام ہے۔ عربی النسل ہیں دوسری یا تیسری صدی ہجری میں جنوبی ہندوستان میں بغرض تجارت آئے۔ اس زمانہ میں یہاں ہندو راجا راج کرتے تھے ان عرب سوداگروں سے بہ آشتی پیش آئے۔ ان کے وجود کو دیس کی رونق سمجھا۔ اور ہر طرح کی مراعات کو ملحوظ رکھا۔ یہ بھی ہندوؤں کے اخلاق مروت و محبت کو دیکھ کر ایسے گرویدہ ہوئے کہ یہیں ڈنڈے ڈیرے ڈال دئیے۔ سوداگر کی نظر اللہ پر رہتی ہے۔ اہل اللہ کی قدمبوسی اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ اللہ والے بھی جہاں اپنی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ جا پہنچتے ہیں اس لیئے اکثر مسلمان فقرا

بھی یہاں آن براجے ہندوؤں کی خوش اعتقادی مشہور رہی۔ جب ان مسلمان بزرگوں نے اپنے کشف و کرامات دکھائے تو بہت سے ہندو عقیدت مندی کی لڑی میں منسلک ہوگئے۔ موجودہ ماپڑلا اس آپس کے گھال میل اور اتحاد و محبت کا نتیجہ ہے۔ پانچ چھ سو برس بحرِ ہند کی تجارت ساری کی ساری ان ماپڑلوں ہی کے قبضے میں رہی اور ہمیشہ اپنے ہندو راجاؤں کے مطیع و فرمانبردار رہے۔ پوری پوری مذہبی آزادی تھی۔ تمام مذہبی ارکان بخوبی بجا لاتے تھے۔ ہندو جن میں یہ رہتے تھے ان کی دل شکنی کبھی جائز نہ رکھتے۔ پھر ایسا زمانہ آیا کہ اسپینی فرنگیوں نے اپنے حاکم مسلمانوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ یہاں تک ہوا کہ اندلس میں ایک مسلمان زندہ نہ چھوڑا۔ یا تو سب کے سب زبردستی کرسٹان بنا لیے گئے یا جان سے مارے گئے۔ جو زندہ بچے اُن کو پادری خاردار کوڑوں سے مارتے ہوئے گاؤں گاؤں سے ہنکاتے ہوئے۔ ساحل تک لے گئے اور ملک سے باہر نکال دیا۔ سات سو آٹھ برس اسپین میں مسلمانوں نے حکومت کی۔ بعد ازاں اس مذہب کا نام لیوا وہاں ایک ذی حیات نہ رہا۔ اِس نئی نئی کامیابی سے اُندلسی فرنگیوں کے حوصلے بڑھے دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی مسلمانوں کے پیس ڈالنے کی ٹھانی۔ آخرکار پرتگالی ہندوستان آئے۔ کالی کٹ میں اُترے۔ یہاں کے راجہ کو زمورن کہتے تھے۔ اِس کی سبھا میں عرب تاجروں کا زور پایا۔ ہر طرح راجہ کو بہکایا پُھسلایا کہ وہ مسلمانوں کو برباد کرے۔ جب راجہ راہ پر نہ آیا تو پاس ہی کے رجواڑے سے جوڑ توڑ کر زمورن

پر چڑھ دوڑے۔ ماپڑلوں نے راجہ کا ساتھ دیا اور خوب لڑے ہندوستان کے مغربی ساحل کی تمام آبادیاں جن میں مسلمان بستے تھے۔ فرنگیوں نے جلادیں۔ مسجدیں ڈھادیں۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ زبردستی بدجانور کا گوشت کھلاتے بپتسمہ دیتے اور صلیب کی پوجا کراتے۔ پادریوں نے ایک انجمن قایم کی جس میں مسلمان مرد عورت زندہ جلائے جاتے۔ گرم لوہے کے تاج اُن کے سروں پر رکھے جاتے۔ ننگا کرکے تازیانہ بجاتے۔ جیتی جاگتی دیواروں میں چُنیدی جاتیں یا زمین میں دبا دی جاتیں۔ غرض فرنگیوں سے ان ماپڑلا مسلمانوں نے بہت ہی دکھ پائے۔ اِن علیسایوں سے ماپڑلوں کی عزت، آبرو، جان، مال، مذہب، ایمان کوئی شئے محفوظ نہ تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماپڑلوں کو فرنگیوں سے قلبی نفرت ہوگئی۔

ظلم کی انتہا ہوتی ہے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اِن امن پسند مسکین ماپڑلوں کا صبر ٹوٹا۔ اور پرتگالی غارت ہوئے۔ ہماری سرکار دولتمدار نے ان فرنگیوں کے مقبوضات چھین لیئے۔ اب مالابار سرکار انگریز بہادر کے قبضے میں ہے۔ ہماری سرکار نے چاہا کہ ان میں تعلیم و تربیت کی اشاعت کرے تاکہ تمام ماپڑلے جو آئے دن جھگڑوں سے جھگڑالو اور فسادی ہوگئے تھے۔ مہذب اور شمالی ہندوستان کے آدمیوں کی طرح شائستہ اور تعلیم یافتہ ہوجائیں۔ لیکن ان بدنصیبوں کا مزاج تو پرتگالی بگاڑ گئے تھے۔ فرنگی بیزاری نے آنکھوں پر ایسی نفرت کی عینک چڑھا دی ہے کہ ہر لال منہ کی ڈائن ہی نظر آتی ہے۔ سگ زرد برادر شغال معلوم ہوتا ہے۔

غرض یہ کسی طرح راہِ راست پر نہیں آتے۔ اور انگریزی تعلیم حاصل کرکے روشن خیال نہیں بن جاتے یہ وحشی امن کی قدر نہیں جانتے۔ آں حضرت صلعم کی اتباع فدائی ہیں۔ اپنی جہالت سے آخرت کے آرام کو دنیا کی آسائش پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس موجودہ ترقی کے زمانہ میں بھی شہادت کو ابدی زندگی تصوّر کرتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ مذہب کی خاطر جان دینے والا بغیر حساب کتاب کے جنت میں جائیگا جہاں عالی شان محل جواہرات سے مرصّع ہونگے۔ اور جہاں سیاہ آنکھوں والی حوریں خدمت کو ملیں گی۔ جہاں رنج وغم بھول کر بھی انسان کے پاس نہ پھٹکیگا ذاتی مفاد ان کے نزدیک خود غرضی ہے۔ مصلحت بینی اور مآل اندیشی بے ایمانی اور صداقت پوشی۔ اپنی ذات کا فکر کرنا۔ اپنی جان کو الگ تھلگ رکھنا۔ آیندہ عیش و آرام کی پرواہ کرنا۔ نفس پروری۔ اپنی چاہنے والی سرکار کے حکم کو مذہبی حکم سے بالا سمجھنا کفر۔ ہماری سرکار نے ان کے ساتھ ہر طرح کی بھلائی کرنی چاہی۔ مذہبی تعلیم جو انسان کو تنگ خیال اور قوم کو متعصّب بناتی اور قومی عصبیت کی روح پھونکتی ہے اس کو ترک کرکے ماٹروں نے انگریزی تعلیم اختیار نہ کی جو انسان کو آزاد خیال اور قوم کو امن پسند بناتی ہے۔ لیکن یہ انگریزی سے بے بہرہ ماٹرلا شورہ پشتی میں اپنے ہم مذہب بھائی آفریدیوں اور وزیریوں کے ہم پلہ ہے۔ فرنگیوں سے عداوت رکھنے میں شہرۂ آفاق اور مذہبی دیوانگی وجنون کا تمغہ یاب۔ ماٹروں کے مولوی تنگال کہلاتے ہیں۔ یہ مذہب کے دیوانے تنگال ہمارے شمالی

ہندوستان کے مولویوں کی طرح سمجھ دار نہیں۔ دنیاوی جاہ وعزت سے سروکار نہیں۔ سرکاری خطابات درکار نہیں۔ اِس عقل سے عاری کو کاشکے اتنی سمجھ آجائے کہ دنیا کو چند روزہ سمجھے۔ جان عزیز کو مذہب کے لئے فضول ضائع نہ کرے۔ اور یہاں کے مزوں کو وہاں کے مزوں کی اُمید موہوم پر نہ چھوڑ دے۔ ملاؤں پر اِن ننگالوں کا مذہبی تقدس کی وجہ سے بڑا اثر ہے۔ اِن کے حکم ماننے میں وہ اپنی نجات تصور کرتے ہیں۔ ہماری سرکار بھی اس اثر سے باخبر ہے۔ ان مجنوں ننگالوں کی خاص طور پر نگرانی کی جاتی ہے خصوصاً ماہِ صیام میں جب کہ ملا روزہ رکھ کر پورا مسلمان ہو جاتا ہے۔ اور مذہبی احکام بڑی خوشی سے بجالاتا ہے اور اسلام کی حفاظت میں دیوانہ جان دینی آسان سمجھتا ہے۔ اس زمانے میں حکام ننگالوں کی بڑی ہوشیاری سے خبر رکھتے ہیں۔ کہ کہیں وہ اپنے معتقدین کو اپنی پاک کتاب میں سے وہ احکام نہ سنا دے جن میں مشرکین سے لڑنے کا حکم ہے۔ یا ایسا وعظ نہ کرے۔ جس سے جنت کی قصر اور خوبصورت حوروں کا یقین ہو جائے۔ اور ملا مطہرہ حوروں کی ملاقات کا مشتاق اور ابدی خوشی کا خواہاں ہو کر اپنی جنگل کی رہایش اور وادی نوردی چھوڑ شہادت کا طالب ہو۔ اور فردوس کے رفیع الشان قصرات کا اعتقاد ملا بار کے سرسبز باغات میں قلی گیری کرنے سے مانع آئے۔ ملے بیحد حاسد ہیں۔ ملا بار میں جب زرخیز قطعات اور سرسبز جار، ربڑ اور گرم مسالوں کے باغات کو فرنگیوں کے قبضے میں دیکھتے ہیں اور ان زمینوں کو جن کی نسبت سنتے آئے ہیں کہ ہمارے بزرگوں

کی تھیں فرنگیوں کے زیر کاشت اور اپنے آپ کو جنھیں اپنے زعم میں مالک سمجھتے ہیں
قلیوں کی طرح قلیل مزدوری پر کام کرتے پاتے ہیں تو اُن کے پیچ و تاب کی کوئی
انتہا نہیں رہتی - باغات کے مالک فرنگی ہیں - انھیں ماپڑ لے اپنے فہم ناقص میں کدنیتی
غاصب تصوّر کرتے ہیں - اور ان باغوں کی ترو تازگی کو دیکھ کر جسے اپنی محنت اور
عرق ریزی کا نتیجہ سمجھتے ہیں ان کے زخم ترو تازہ ہوتے رہتے ہیں - ان بیوقوفوں
کا خیال ہے کہ انگریز جو غیر ملکی ہیں - انھیں ہمارے ملک کے سرسبز قطعات کی ملکیت
کا کوئی حق نہیں - اور وہ اس روپے کے جو ہماری اپنی محنت سے پیدا کیا جاتا ہے لینے
کے مستحق نہیں - شراب جو زندگی کی بہار ہے اس سے بہت متنفر ہیں - اور چاہتے
ہیں کہ انگریز اس ملک میں اس کی درآمد بند کردیں اور اس طرح اس نعمت عظمیٰ سے
جو ہماری جدید تہذیب کی علامت اور تعلیم یافتگی کا نمونہ اور شائستگی کے ساتھ ساتھ
ہے ملک کو محروم کردیں - خلافت کی حفاظت میں ایسے اندھے ہوئے ہیں کہ ملک کے
بہتے دریاؤں ٹھنڈی باؤلیوں، پاک صاف چشموں کو چھوڑ کر مذہب کی حفاظت
میں جان دے کر کوثر اور سلسبیل سے تشنگی بجھانی چاہتے ہیں - اس جوش ایمان
بالفاظ دیگر مذہبی جنون کا نتیجہ تھا کہ بہت سے ماپڑ لے مارے گئے - ان کی لاشیں کسی
جگہ پر سرکار نے جلوائی تھیں - حال میں اس جگہ پر مسلمان جمع ہوئے اور فاتحہ پڑھی -
ہماری سرکار نے مُردوں کی فاتحہ دلانے کو مشتبہ نظروں سے دیکھا - وعظ وغیرہ جو ہوئے
وہ خلاف مصلحت ملکداری سمجھے گئے - سرکار کو بلوے کا اندیشہ ہوا - ماپڑ لا نمائندوں

کی گرفتاری کا حکم ہوا - کچھ پکڑے گئے - کچھ روپوش ہوئے - سب سے بڑے ماپلا مولوی
کو گرفتار کیا گیا جس کا زہد و اتقا اور مذہبی تقدس ماپلوں میں مسلّم تھا - ماپلے
بگڑ گئے - لاٹھیاں لے کھڑے ہوگئے لوٹ کھسوٹ مچا دی - اس لوٹ میں کچھ بندوقیں
بھی ہاتھ آگئیں - عورتیں اور آٹھ آٹھ برس کے بچّے قوم کے شریک حال ہوئے -
شوقِ شہادت میں نکل کھڑے ہوئے - ماپلا عورتیں لڑنے والوں کے لیئے کھانا
پکاتی ہیں - اور ماپلا بچّے ہماری سرکار کی جاسوسی کرتے ہیں - مرد عورت بچّے
سب کے سب نقصان یکساں طور پر پہنچا رہے ہیں جب برابر کی سزا دی جائے گی
تو مفت میں چیخ پکار مچے گی - بڑی خوشی کا مقام ہے کہ آج کل سیّد حسن صاحب اور
ہارنامن صاحب ہندوستان نہیں ہیں - ورنہ مالابار میں امن ہونے کے بعد
غیر سرکاری تحقیقاتی وفد جاتا اور اُن لوگوں سے جو اس فساد میں شریک ہوئے ہیں
بیان لے کر تحریر کرتا اور وہ سب تدابیر جو فساد فرو کرنے میں اختیار کی جائینگی
قلمبند کرتا اور رعیت کے ظلم، جبر و تعدی سے ہماری رحم دل رعیت پرور سرکار کو
متہم کر کے بیرونی اقوام کی نگاہوں میں ذلیل کرتا جیسا کہ پنجاب کے معاملے میں ہوا
کہ قصور تو خود اپنا تھا اور سرکار کو سارے جہان میں بدنام کیا - سنا جاتا ہے کہ ماپلوں
نے جہاد کا اعلان کر دیا ہے - سبز جھنڈا قومی نشان قرار پایا ہے - علی موسلیاران کا
سرگروہ ہے - سارے مالابار میں ایک ودھم مچادی ہے - اکثر جگہ لوہے کی پٹریاں اکھاڑ دیں
تار کاٹ دیئے - لیکن کہاں حاکم اور کہاں محکوم ہماری اقبال مند سرکار کے سامنے

کب ٹھہر سکتے ہیں - کہاں کلدار توپیں اور کہاں جنگل کے کٹے بانس - سرکار نے بھرکس نکال دیا - انگریزی اخبارات ذی الحجہ کے آخر تک کوئی ساڑھے تیرہ سو کے قریب ماپلوں کا اتلاف جان بتاتے ہیں - اور ہماری سرکار کی طرف سے دو تین ہی تصدیق ہوئے ہیں - ہماری سرکار کا اقبال شامل حال ہے - جن صاحب بہادروں کے قتل کی غلط خبریں اخباروں میں شائع ہو گئی تھیں، وہ ہمارے سرکار کی تجباوری سے زندہ ہو کر امن کے مقامات میں چلے آئے ہیں اور اخبارات نے ان خبروں کی غلط اشاعت کا اعتراف کر لیا ہے - ٹیمز آف انڈیا جو لکھتا ہے - اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری سرکار سے لڑائی نہیں ہے - بلکہ لڑائی ہندوؤں سے ہے - کیونکہ بجائے گرجا گرانے اور عیسائیوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے، ہندو ہی لوٹے گئے - ان ہی کی عبادت گاہیں لٹیں - مورتیاں ہٹائی گئیں - عورتوں سے بدسلوکی کی - بچوں اور بڈھوں سے سختی - اس کا نتیجہ ہے تو بہت اچھا - کیونکہ ہندو مسلمان بہت اتفاق اتفاق چلاتے کودتے پھرتے ہیں - اگر ایسے ہی امن پسند ہماری سرکار کے خیر خواہ نمک حلال دو چار مضامین لکھ دیں تو ہندوؤں کے کان ہو جائیں اور وہ مسلمانوں سے فوراً قطع تعلق کر لیں - میری رائے میں ہم امن پسندوں کو چاہیئے کہ اتنی سی تکلیف کریں کہ کچھ روپیہ اکٹھا کر کے دو چار ہندو کرایہ پر لیں اور ان کے ختنے کر کے انھیں پھرائیں - اور کہیں کہ یہ ماپلوں نے ظلم کیئے ہیں اور وہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کر رہے ہیں - اس سے بہت مفید نتیجہ نکلے گا - اور

ہندو اس بلوے میں شرکت سے احتراز کرینگے۔ اور اگر اس سرکشی کو ہم نے کچل دیا تو انشاء اللہ پھر ہندوستان میں خلافت اور ترک موالات کی تحریک ٹھنڈی ہو جائیگی اور لوگوں کے جوش اس سے دھیمے پڑ جائیں گے۔ پھر ہر شخص اس قسم کی قومی تحریکات سے اجتناب کریگا۔ امن قایم رکھنے کی خاطر ہم کو ہر طرح کی جائز ناجائز تدابیر اختیار کرنی چاہیئے۔ کیونکہ پادری جب جاہل مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کی آواز بلند کرتے تھے تو خود اپنے جسم زخمی کر کے گاؤں گاؤں کہتے پھرتے کہ عربوں نے ہمیں مارا ہی۔ اس طرح سے نفرت اور دشمنی پیدا کر دیتے تھے۔ ہماری سرکار بڑی رحیم ہے۔ جس کے مذہب میں درگزر بڑی صفت ہی۔ ماپلے جاہل۔ اجڈ۔ متعصب ہیں اور ہماری سرکار بڑی رحیم۔ مہذب تعلیم یافتہ رعیت پرور ہی۔ جس کے مذہب میں درگزر بڑی صفت ہی۔ وہ ان سب دقیانوسی کی خطا کو معاف کر کے اپنی طرف دیکھے اور ماپلوں کی ابلہانہ روش کا جواب ظلم سے نہ دے۔ ان کے قصور کو معاف کر کے شان عفو دکھائے اور تاریخ میں اپنی رحم دلی اور درگزر کی سنہری یادگار چھوڑ جائے۔ ہندوستان کے با اثر اشخاص کو چاہیئے کہ وہ سرکار سے سفارش کریں اور بیچ میں پڑ کر صفائی کرا دیں۔ بہت ثواب ہوگا ورنہ مفت میں لاکھوں مسلمانوں کا خون بہے گا۔ ماپلوں کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہی سب کے سب بے حد مذہبی ہیں۔ سرکاری آدمی کہتے ہیں کہ ترک موالات اور خلافت کے مسائل نے اِن کی یہ درگت بنائی ہی۔ اب حامیانِ خلافت و ترک موالات کو چاہیئے

کہ انھیں سمجھائیں اور اِس خطرے سے ان کی جانوں کو بچائیں۔ اِن لوگوں میں ایک یہ افواہ یقین کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے کہ مہاتما گاندھی جی اپنی فوج ان کی مدد کے لیئے لائینگے۔ ماپڑلوں کا دل مہذب اقوام کی حرص کرنے کو چاہتا ہے۔ فرنگی جو اکّا دکّا ان کے ہاتھ پڑ گیا ہے، اس کو انھوں نے قید رکھا ہے اور ہر طرح سے آرام پہنچاتے ہیں۔ قیدیوں کو جان سے نہیں مارتے۔ ایک آدھ جگہ خندقیں کھود کر ہماری سرکار کی فوج ظفر موج پر حملہ کیا۔ لیکن کل دار توپوں نے مجاہدین کے چیتھڑے اُڑا دیئے۔ جہاں کہیں ایک صاحب بہادر کا خون گرا، اِس کی پاداش میں یہ سیاہ فام سیاہ بخت ماپڑلے مسلمان سینکڑوں ہی مار ڈالے گئے۔ حال ہی میں بروز جمعہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ کو ہماری سرکاری فوج سے گیارہ بجے دن کے پوٹوکارمیں ماپڑلوں سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ پانچ گھنٹے رن کا میدان گرم رہا۔ ہماری سرکاری فوج مسلح، ان بھگڑوں کے کپڑے تک درست نہیں۔ کیا خاک مقابلہ کرتے۔ کل دار توپوں کے منھ پر رکھ لیئے گئے۔ قضا سر پر کھیل رہی تھی جوشِ مذہبی سے بے خود ہوگئے۔ ہمیں مار ڈالو۔ ہمیں مار ڈالو چیختے ہوئے سرکاری توپوں کے منھ پر جا پڑے اور آخر کار سنگینوں پر رکھ لیے گئے۔ دست بدست جنگ ہوئی۔ انھوں نے بھی لٹھ چلائے دو گورے بہادر ایک اور افسر صاحب مارے گئے اور یہ دیکھے حاکم کو چھوڑ کر ان دیکھے کا حکم ماننے والے چار سو وہیں کھیت رہے۔ ان کی بیخ کنی کے لیئے ہماری سرکار چاروں

طرف سے فوجیں سمیٹ کر بھیج رہی ہے۔ فوجی قانون بھی نافذ ہے۔ اللہ پاک اپنا رحم فرمائے اور کل ہندو مسلمان بھائیوں کو نیک توفیق دے! آمین ثم آمین!!
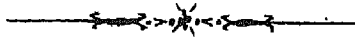
غدر کی کہانی کپڑے والی فضل النساء کی زبانی

حیدری بیگم صاحبہ بنت نواب علی محمد خاں جو زینت النساء بیگم بنت اورنگ زیب کی اولاد سے تھیں، انھوں نے غدر دہلی کا ایک روزنامچہ اپنے کل خاندان کے مردوں کی پھانسی سے متاثر ہو کر مرتب کیا تھا۔ بیگم صاحبہ موصوفہ چوں کہ سرکار برطانیہ کی وظیفہ یاب تھیں، اس لیئے کچھ اہل خاندان کی نمامی سے وہ روزنامچہ ضبط سرکار ہوا۔ تاہم اپنی یاد سے انھوں نے ان تمام دردناک واقعات کو پھر مرتب کیا۔ میں نے بہ شوق اُن سے ورثتاً پایا، اور اس میں کی خراب باتیں نکال کر کہانیوں کے طور پر ترتیب دی یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اس کہانی میں میں نے خود فضل النساء پارچہ فروش سے مل کر تمام واقعات جو اُنکی ذات سے متعلق تھے دریافت کر کے قلم بند کر دئے اور ایسی باتیں جو حکومت کے خلاف تھیں، ان کو قلم انداز کر دیا ہے۔ کیونکہ ان سے پڑھنے والوں کو سوائے رنج و کوفت کے اور کچھ حاصل ہوتا۔ میں نے ان تمام لوگوں سے جو غدر ۱۸۵۷ء میں حیات تھے مل کر ان کے تمام چشم دید واقعات اور شنیدہ حالات

کو لکھ لیا ہے۔

افضل النساء رنگت گندمی رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں، بال اور پلکیں بھویں تک سفید دانت صحیح سلامت۔ کشیدہ قامت۔ اس بڑھاپے میں اچھی دیدارو ہیں۔ بہت ایمان دار ہیں۔ کپڑا گھر گھر بیچتی پھرتی ہیں۔ اور اس کے نفع سے اوقات بسر کرتی ہیں۔ میرے ہاں آئیں تو میں نے باتوں باتوں میں غدر کا حال دریافت کر لیا۔ جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے لکھ لیا ہے تو غش کی نوبت تھی۔ بہت گڑگڑائیں کہ زمانہ خراب جا رہا ہے ایسا نہ ہو کہ کچھ ان پر بن جائے۔ میں نے اُن سے وعدہ کر لیا کہ اشاعت نہ ہوگی۔ مرگئیں تو کوئی قبر تو کھودنے سے رہا۔ جس پر انھوں نے کہا کہ میاں اس کو بھی بعید نہ سمجھو۔ غرض واقعاتِ غدر سے زیادہ دبدبۂ اُن کا خوف و ہراس تھا "پس پردہ" میں کچھ تبدیلی کے ساتھ عمدہ خانم کے رنگ میں بی افضل النساء ہی ہیں۔

میں اس کہانی کو اپنے پیارے دوست خواجہ حسن نظامی صاحب کے نام نامی پر معنون کرتا ہوں۔

اے ہے میاں۔ غدر کی۔ للہ نہ پوچھو۔ اے اللہ دشمن کو نہ دکھائیو۔ برس دن ست ہی ست پر گزری۔ استانی کے ہاں میں تھی کہ اتنے میں میرے ابا جن کا نام الٰہی بخش تھا اور قلعے میں کبوتروں کو دانہ دینے پر نوکر تھے، ہانپتے کانپتے

بھاگے ہوئے آئے۔ کنڈی کھٹ کھٹائی اور مجھ سے کہا کہ جلدی گھر چل۔ شہر میں بلوا ہو گیا ہے۔ رات کو پانچ آدمی آئے۔ بہتیرا شہر کا دروازہ کھلوایا۔ پہرے دار نے نہ کھولا۔ صبح ہوتے ہوتے اور بیسیوں آ ملے بادشاہ نے کہوایا بھی کہ ارے کمبختوں کیوں میری ضعیفی میں مٹی پلید کراتے ہو۔ لیکن انھیں ایک ماننی تھی نہ مانی غرض دروازہ کھلا۔ وہ گھس آئے۔ قلعہ میں ہنگامہ ہے۔ بادشاہ سلامت کو قید کر لیا ہے اور سارے محلّوں کو گھیر لیا ہے۔ اللہ ہی ہے جو خیر ہو۔ استانی جی میری سن گھبرا گئیں۔ گھر میرا لاہوری دروازے فصیلوں میں تھا۔ تھوڑے دنوں تو وہیں رہے لیکن پھر جو گولا پڑا تو میرے نانا جن کا نام خدا بخش تھا۔ آئے مجھے اور میری امّاں کو جن کا نام فضل النساء تھا لے کے حبلی قبر اعظم خاں کی حویلی میں اپنی بہن لاڈو خانم کے ہاں چھوڑ گئے۔ تین مہینے ہم یہاں رہے۔ ابّا میرے افیون کے عادی تھے۔ وہ کلموئی آئی نہ میسّر۔ ان کا ہوا بُرا حال۔ ایسا کہ لبوں پر دم آ گیا۔ گھر میں کوئی آدم نہ آدم زاد جو پانی کی بوند بھی حلق میں ٹپکائے۔ مٹکے سوکھے پانی کی بلوں بلوں۔ اتنی اُن میں سکت نہیں جو باہر نکل سکیں۔ جب مارے پیاس کے بے تاب ہوئے تو بڑے روئے اور گڑگڑائے۔ روئے جو سہی تو وہ موسلا دھار پانی پڑا اور اتنا برسا کہ دو کٹورے پانی کے بھر گئے۔ انھوں نے وہ پی لیئے۔ گورے گھس آئے تھے اور پانی پینے سے اُن میں ذرا آیا دم۔ رات کو چپکے سے نکل گھٹتے گھٹاتے میرے نانا کے مکان تک آئے

یہاں مارے ڈر کے میرے نانا نے دروازے کو تیغہ دیدیا تھا۔ ابّا نے جو دروازہ
میں تیغہ لگا پایا۔ تو بڑے پریشان ہوئے۔ لیکن رات کو میری نانی تہجد کی نماز
کو اٹھتی تھیں اور خالہ کی آنکھ ڈر کے مارے نہ لگی تھی۔ ابّا نے جو دی آواز
تو نانی اور خالہ دونوں کی دونوں ڈر گئیں۔ نانا کو اٹھایا۔ انھوں نے آواز
پہچان کے کہا۔ کون ہے؟ الٰہی بخش؟ ابّا نے کہا کہ ہاں باوا! میں ہوں۔ نانا نے
کہا پچھواڑے سے آجاؤ ہمسائی کی کھڑکی میں سے۔ ابّا نے کہا کہ میں تو ہل بھی
نہیں سکتا۔ گھٹنوں گھسٹتا تو یہاں تک آیا ہوں۔ اب تو ذرا دم نہیں۔ نانا میرے
گھبرائے۔ باہر جا چڈّی پہ ڈال اندر لائے۔ صبح ہوتے ہی چپلی قبر آئے۔ امّاں
کو لے گئے۔ وہ گئیں تو دیکھا سارے لت پت ہو رہے ہیں۔ انھوں نے جلدی
پائجامہ اتروا دھو دھلا صاف کیا۔ آدھے شہر میں گورے گھس آئے تھے۔ ابّا
کی چارپائی انگنائی میں بچھی تھی۔ اور سب اندر دالان میں تھے۔ جھٹ پہ دھم دھم
کی آواز ہوئی۔ سب کے سب ڈر کے سہم گئے۔ اتنے میں ایک دھڑاکے کی آواز
ہوئی۔ اوپر تھی تختہ بندی کی دیوار۔ نگوڑے گورے دیوار پر سے جھک کے
نیچے گھر میں جھانکتے تھے کہ ساری تختہ بندی نیچے آن پڑی۔ ابّا کی چارپائی
نیچے ہی تھی۔ ایک دھاڑ ماری اور پھر کا بھی نہ کھایا۔ چادر جو اوڑھے تھے۔ اُس
میں لپیٹ نانا دو تین محلّے کے مردوں کو لے باہر دوکان میں گڑھا کھود دبا آئے
لوٹتے ہوئے گوروں نے دیکھ لیا۔ نانا بڈّھے پھونس ایک ہی گولی میں فیصلہ ہو گیا

میری ممانی کے دو دہیز و خنگی خنگی صندوق تھے۔ نانی اور خالہ نے انھیں توڑ نانا کو اپنے روپٹوں میں لپیٹ یار ا مار گڑھا کھود چار مہینے کے لیئے زمین میں امانت رکھ دیا۔ اور سب بھاگ کر چلی قبر آ گئے۔ شہر میں گورے کالوں کی برابر جاری ہمارے پچھواڑے شہزادے جواں بخت کی سسرال تھی۔ گورے غارتی رات بھر ان کے دروازے کی زنجیاں کاٹتے رہے۔ اور ہر ٹھنا کے کیساتھ ہمارے دم نکلیں۔ اماں نانی اور ساری گھر کی عورتیں۔ مرد سے کے نام تو چڑیا کا بچہ تک نہ تھا۔ قران شریف کھولے گھڑی چھت پر چڑھتیں اور گھڑی نیچے اترتیں۔ سب پڑھ پڑھ کر چاروں طرف دستک دیں اور بال کھول کھول کے دعائیں مانگیں کہ الٰہی مردوں کی جانوں اور عورتوں کی آبروؤں کا تو ہی والی ہے۔ میں زار قطار روؤں۔ سامنے پہاڑی پر گولیاں سائیں سائیں جائیں۔ دھنا دھن۔ ٹھوں ٹھائیں۔ ٹھنا نانا کی آوازیں کلیجے نکالے دیں۔ کس کا کھانا کس کا پانی۔ جانوں اور آبروؤں کی لالے پڑے دے۔ - - - اور میاں! اعمالوں کی شامت دیکھو کہ پہلے اچھے خاصے نکل گئے تھے۔ سنا تھا کہ بادشاہ جا رہے ہیں۔ ساری خلقت شہر سے اُن کے ساتھ نکل رہی ہے۔ ہم عورتیں گھر سے حق تو حق تو کرتی نکلیں۔ مٹیا محل کے بازار سے لے کر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک آدمی کا وہ حال کہ میں تجھ پر اور تو مجھ پر۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ جہاں پناہ بچارے تام جھام میں سوار ایک ایک آنکھ سے ہزار ہزار آنسو جاری۔ بہ بہ کے نورانی مقیش سی داڑھی پہ آئیں۔

آپ رومال سے اُنھیں صاف کرتے ہوئے۔ آثار شریف کی زیارت کرکے رخصت ہونے آئے تھے پیچھے پیچھے قوال۔ بادشاہ سلامت نے جو غزل اپنی بپت کہانی میں کہی تھی۔ گاتے ہوئے آدمی روتے روتے لوٹے جائیں۔ اور پٹیک پیّا پڑی کہ العظمت للہ کلیجے میں کس کے طاقت ہے جو بیان کرے۔ اسے ہی یاد یہ پھر جائے لوکا۔ اس کا اب ایک بول بھی تو یاد نہ رہا۔ میں نے تو خوب صاف صاف سُنی تھی۔ کیوں کہ پیچھے جو ریلا آیا تو نانی بے چاری گرگئیں اور میرا ہاتھ اماں پکڑے ہوئے تھیں۔ ہم دونوں جنیاں تام جھام تک زینہ سے ادھر جا پہنچے۔ جان نانی میں پڑی تھی کہ الٰہی کچل گئیں یا کیا ہوا؟ پھر پلٹے۔ انھیں ایک جگہ پڑا پایا۔ ساتھ لے پھر گھر واپس گئے۔ پھر تو گورے گھس ہی چکے تھے۔ نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن جب جہاں بخت کی زلفیاں کاٹ اندر گھسے اور عورتوں کے رونے پیٹنے اور چیخنے کی آواز آئی تو پھر جو جس حالت میں تھا نکل کے بھاگا۔ ننگے پیر ننگے سر۔ کس کا بُرقعہ کس کی چادر۔ گرتے پڑتے۔ رستہ معلوم نہیں کہ کدھر جائیں جانے کدھر کے کدھر نکل گئے ہزاروں عورتیں۔ مرد وئے۔ بچے کچے چیختے چلاتے۔ روتے بلبلاتے ادھر کے اُدھر بھاگتے پھرتے۔ ہم سب بھی اُن میں مل گئے۔ جانے لاہوری دروازہ تھا یا مور ی دروازہ یا خدا جانے کہ کابلی دروازہ تھا۔ غرض ہوش نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں۔ بازار لاشوں سے پٹے۔ جگہ بجگہ خون کے تھکّے کے تھکّے۔ قدم قدم پر سر اور دھڑ پڑے ہوئے دروازے سے باہر جو نکلے۔ پہرے داروں نے جو جس

کے پاس تھا سب دھروا لیا۔ اوڑھنے کے کپڑے تک چھین لیئے۔ سڑک کے دونوں طرف کپڑوں کے انبار لگے۔ رات ایک پرانا تہ خانہ تھا وہاں بسر کی۔ لیکن آنکھوں میں نیند کہاں۔ پلک سے پلک نہ لگی۔ ساری رات لرزتے گزر رہی۔ رات بھر شہید مرد ادھر سے اُدھر پھرتے دکھائی دیں۔ تلواروں کے کھچاکے اور خون کے فرّاٹے کی آواز کلیجہ دہلائے دیتی تھی۔ پہلے تو میں ضبط کرے بیٹھی رہی۔ آخر ایک چیخ ماری۔ اور رونا شروع کیا۔ میری چیخ اور رونے سے جو بچے سو رہے تھے ان سب کی گھگی بندھ گئی۔ پھر جو کہرام مچا ہے تو توبہ ہی ہے۔ بڑے بوڑھے ایک کا ایک منھ تکیں اور بچے بلک بلک کر اور تڑپوں سے لپٹ لپٹ کر روئیں۔ مردوں کو موت ہاتھ بھر کی رسّی اور درختوں کے جھونٹے دکھائی دیں تین دن میں مرتے گرتے تغلق آباد پہنچے وہاں نگوڑے گنواروں نے ظلم توڑے۔ سب کو پکڑ لیا اور کہا کہ جب تک آدمی پیچھے روپیہ نہ لے لیں گے نہ چھوڑینگے۔ جن کے پاس تھا دے کے چھٹکارا پایا۔ یہاں کیا خاک دھری تھی جو اُن کے دیدوں میں جھونکتی سارے دن ساری رات بندھے بیٹھے رہے۔ کھائے ہوئے تیسرا دن تھا۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو اور پانی کے ایک ایک گھونٹ کو ترسیں اور میسّر نہ آئے آخر خدائی خواروں نے ہار جھک مار چھوڑ دیا۔ برسوں جنگل کی خاک چھانی۔ میاں جانی! بیان کرنے کو کس کی چھاتی لاؤں۔ دل میں طاقت نہیں۔ الٰہی اب نہ دکھائیو اور اس دن کو موت دیجیو۔ گوروں کے سلوک

جو جو انھوں نے مرد عورت سے کیئے۔ بیان کروں تو بگڑی جاؤں۔ خدا کیلئے
کچھ ایسی ویسی نہ لکھ لینا جو بڑھاپے میں مٹی خوار ہو۔ اور گھسٹتی پھروں شہزادیوں
کی تو وہ خواری بھی کیا کہوں۔ چوٹیاں پکڑ کے سڑکوں پہ گھسیٹتے تھے۔ جھوٹوں
کوئی کسی کو شہزادہ بتا دے بس اس کی اجل تھی۔ لیا گھوڑے کے دُم سے
باندھا اور بھگا یا گھوڑے کو یا سڑک پر ڈالا اور بیلن چلا دیا۔ ہڈیاں پِس کر ملیدہ
ہو جائیں۔ قیامت تھی قیامت نہ داد نہ فریاد۔
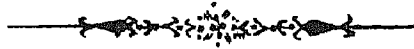
کوارپٹ

اللہ، رسول، بزرگ، ولی، پیر فقیر، روزہ نماز، خیرات زکوٰۃ، صدقہ سلا
لین دین - داد دہش - ذات برادری - کنبہ رشتہ - دوستی اپنایت - ہمدردی
مروت - میل جول - شادی خوشی - تیر تھوار - عید بکرید - بناؤ سنگار - سلیقہ سگھڑاپا
کام دھندا - ڈھنگ قرینہ - خدمت عظمت - قدردان سرکاریں - وفادار
نوکر - شرم حیا کی لڑکیاں - غیرت دار لڑکے - خوشرو بیویاں - بہادر مرد
شریف گھرانے - محبت کے لوگ - پالنہار راجہ - جاں نثار پرجا - بادشاہ
راضی - رعیت خوش - سستے سماں - کھانے میں حلاوت ہر بات میں مزا
تحفہ سے تحفہ کپڑا - اچھے سے اچھا گہنا - پان سیر کا گی - پیسے میں آٹھ سوٹے
دہی بڑے - تنی کی پھلکیاں - سونٹھ پانی کے بتاسے - چل چرپرے - چھوارے
کی چاٹ - پکوڑیاں - آلو کے کچالو - قلمی بڑے - پیسہ دیا، دونا بھر کے ڈھکن
سی چیز آئی - پھل پھلاری - نت نئے رت کے میوے - سلائی ٹکائی - کتر بیونت
غرض جتنی اچھی چوٹی کی چنندہ باتیں تھیں وہ اسکے کوارپٹ میں موجود - کوئی بات
نکلی اور وہ اسنے اپنے کوارپٹ کی سند پیش کی - کہاں ہمارے کوارپٹ میں

یوں نہیں، یوں ہوتا تھا۔ ہولیاں انوکھی۔ ساون نئے۔ کہانیاں پہیلیاں۔ ان مل کہہ مکرنیاں۔ مثلیں۔ کہاوتیں۔ شعر غزلیں۔ جب مجھے سُن سُن کے اچنبھا ہوتا تھا۔ کہ دو ئی دوا کا گوار پٹ تو اللہ میاں کی جنت اور اندر سبھا سے بھی سوا ہو گیا۔ جہاں فرصت سے بیٹھی اور دوا کے یہی ذکر چھیڑا۔ میں بڑے شوق سے سنتی۔ ان سب باتوں کا ایسا ہی یقین تھا جیسے قرآن و حدیث کا۔ کیونکہ دوا میری جھوٹی نہ تھی۔ جب میں شوق سے بے قرار ہو کہتی "اے ہے دوا! تیرا گوار پٹ میں نے نہ دیکھا!" بلائیں لے مجھے چھاتی سے لگا لیتی۔ اماں جان کے ڈر سے کبھی میں نے یہ نہ کہا کہ "دوا اپنا گوار پٹ مجھے بھی دکھلا۔" میں ننھی سی تھی تو میں نے ایک دفعہ کہا۔ "دوا مجھے بزار لے چل" دوا حضرت نے منع کیا۔ وہ تھیں وہمن، کہیں آنے جانے نہ دیتی تھیں۔ میں نے کی ضد تو اماں جان نے خوب مارا۔ اُس دن سے میں نے توبہ کی اور کہیں جانے کا نام نہ لیا۔

گوار پٹ میں نیروں کا توڑا تھا۔ ستراں برس دوا کے گوار پٹ ہی میں کٹے اور نیر نہ جڑا۔ کپڑا لتا۔ گوٹا کناری۔ لہنگا پانا۔ عطر پھلیل۔ کاجل مسی۔ چوڑی مہندی اللہ کی دی سب تھے تھی تو گوار پٹ میں۔ لیکن بڑی مصیبت تھی کہ بن بیاہی لڑکیوں پر سب حرام۔ اس شہر کی یہ ریت ہی نرالی تھی۔ اور بیاہ لڑکیوں کو راس نہ تھا۔ دوا کا بیاہ ہوا۔ تو دلی آئے۔ غدر پڑا یہ شہر تباہ ہوا۔ جھجر بھاگے وہ اُجڑا تو پھر ادھر پلٹے۔ وزیر آباد سے دریا اتر باغپت پہنچے، وہاں کھسوٹ سے ڈر ماری پت

کی طرف نکل گئی۔ غرض یونہی خوار و خستہ ویران تیران پڑی پھری اور ماما گیری کے
جھگڑوں میں پڑ گئی۔ میں جب اس کے رنڈ رونے اور دکھڑے سنتی تو روتی اور
دل ہی دل میں کہتی نہ کنواریت سے نکلتی نہ یہ بپت پڑتی۔ وہ وئی صدقہ در گور ایک
نگوڑی کنگھی چوٹی۔ مانگ پٹی۔ بننا سنورنا۔ پہننا اوڑھنا۔ نہ سہی نہ سہی۔ دل کو تھا تو
چین۔ اپنے بجاتی تو بھی آنند کے تار۔ ذرا صبر سے بیٹا مارے بیٹھی رہتی۔ کچھ دن
کی بات تھی۔ یہ قید واں بھی نہ رہتی۔

للوؤں کی حکومت پہنچی۔ کرسٹانوں کا عمل دخل ہوتا۔ بھائی بند۔ کنبے رشتے
کا کوئی ولایت ہو آتا۔ ساری پابندیاں بیٹیوں پر سے اٹھ جاتیں۔ دن عید رات
شب برات۔ خوب بےفکری سے گل چھرے اڑاتیں۔ وہ ایسے مزے میں ذکر کرتی
تھیں کہ میں اس کے کنواریت کو اپنی پیاری دلی سے بھی اچھا سمجھنے لگی۔ ہم بہنوں
کے کئی جگہ سے پیام آئے۔ نانی حضرت نے گڑے مردے اکھاڑے حسب نسب
میں عیب نکالے۔ باوا جان نے انکار کیا۔ بات گئی گزری ہوئی۔ میرا ہیٹھا برس
تھا اور میں ہیلوٹی کی تھی اکثر بڑانی مامائیں اصیلیں کہتی تھیں کہ سرکار کنوار کوٹ جنوائینگے
میں جی ہی جی میں خوش ہوتی اللہ آمنا دے کہ باوا جان جلدی سے جنوائیں اور ایسی
آبادانی ہو اور اچھی چیزیں مہیا ہو جائیں کہ وہ اگلے کنواریت کو بات کردیں۔ اب
جان تیوں انجانیوں دونوں کے سامنے ہانکے پکارے کہتی ہوں، خدا میرا واحد
نیا ہر ہے کہ وہ اہی کا کنواریت نہیں، میرا بھی کنواریت عیش مسٹدل شاد نگر تھا

غلطی سے لوگ کواری کہتے تھے ہیں تو راج کماری تھی۔ یاں کے تار تر تنگے گاڑھے گزی پہ سے سن پٹ کے سیو نتار۔ یاں کے روکھے سوکھے پہ سے پانی پت کی ملائی صدقے۔ یاں کی سادگی پہ سے اندر پت کی پرانی شان شوکت قربان اور یہاں کے گدڑوں پہ سے بنارس کے زربفت اور کمخواب۔ یہاں کے ایک پیسے میں جو برکت ہے خصم کے پانسو میں وہ بات نہیں۔ بیاہ نہیں۔ بے آہ ہے شوہر چاہتا ہے۔ دموں دیوانہ عاشق زار ہے۔ موٹے جنتا ہے۔ پھوٹی تقدیر یہ اور بھی مصیبت۔ جتنا چاہے اتنا ہی برا اسرا کی پابندی۔ عمر قید۔ کریں نانی، بھریں نواسی۔ نانی حوا کی کرنی بھگتان ہم بھگت رہے ہیں اللہ میاں کا قرق امین قاضی آیا، میرے کوارپت کی ضبطی ہوئی۔ دولہ درو غہ مقرر ہوا۔ چاہے کتنی ہی آزادی دے۔ قید تو قید ہی ہے مشقت مزاج داری ہمیش کو مزاج کی ٹہول میں رہو۔ اپنوں کو چاہا خدمت کی۔ دعا لی "بیاہ ہو" ایسے ارمان کو سلام جس کے بعد انسان پشیمان ہو بور کے لڈو کیوں کھائے اور پچتائے۔ لوا . . . . ! تیری محبت کے صلے میں میں دعا دیتی ہوں "بنو تیرا کدھی بیاہ نہو" یہ سن کے تیرے پیارے مجھے بھوگ سنائیں گے۔ میری دعا کو بد دعا سمجھیں گے۔ میں تجربے کی کہتی ہوں چاہنے والا میاں تنکی بدگمان۔ مرضی کی شادی دو کوڑی کی کہ عمر قید ہے تو بھو۔ لیکن سے برا مانے گی اور اسے سراب جانے گی۔ میں تو تیرے بھلے کو کہتی ہوں کہ اسے کنوں ہن کنیا تو سدا کنواری رہے۔ تیرے دل

کا ارمان اندر کے کندھریوں سے سنجوگ ہو کے نکلے۔ تو میرے لیئے دعا کراو۔ دوستی کا حق ادا کر۔ شادی ہوئی خیر۔ لیکن بانجھ بنجوٹھی کی گرہ لگ جائے!
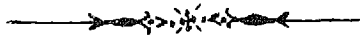
سارے دالان میں تین سُکھ کی سفید چاندنی کا فرش تھا۔ آنکھ میں میل چاندنی
میں میل کا نام نہ تھا۔ دوہرے دالان اندر کے دالان شہ نشین کے بیچ کے در کے
نیچے سفید براق سا غلاف چڑھا ایک بڑا سا گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ چنبیلی کے جال کی سفید
دودھ سی سوزنی بچھی۔ قرینے سے گلناری تراش کے میر فرش رکھے۔ سلوٹ کہیں
دیکھنے کو نہ تھی۔ دیواریں سفید جھاگ۔ روشن روشن کھلا کھلا گھر کہ دیکھنے والے کی
آنکھیں کھلیں۔ جی روشن ہو۔ چاروں طرف دیواروں میں قاعدے سے دلیاں۔
بنگڑے دار محرابوں کے طاق۔ ایک کا ایک جواب۔ نگوڑے اگلے زمانے والے
ہر بات میں شاعری دکھاتے تھے۔ مکان بنائیں گے تو جیسے شعر میں ردیف قافیہ
بحر ہم وزن۔ ایسی خوبی اور صنعت مکان میں رکھتے تھے۔ اور کمال یہ تھا کہ اگر کوئی
نکتہ چین بدبین کسی بات میں زیادتی کرنی چاہے۔ اصلاح دے تو اچھی بھلی چیز کا
ناس کر ہونڈا بنا دے۔ غرض جو چیز جہاں بن گئی وہیں خوب سجی۔ طاقوں میں غلطے
کے طاق پوش نیچے۔ چینی اور جاپنی کے خوبصورت خوبصورت گلدان اور برتن سجے
قطعے، رُباعیاں اچھے اچھے قول چوکھٹوں میں جڑے۔ میر پنجہ کش اور یاقوت رقم
کے ہاتھ کے لکھے۔ قاعدے سے دیواروں میں لگے۔ گلدانوں میں گھر کے بنے

گلدستے۔ جن میں گلاب کی زیادتی آس پاس چنبیلی کی لڑیاں پڑیں ہر چیز سلیقہ سے اپنی جگہ دہری غرض سارا مکان مشرقی مذاق اور دلّی پیاری کی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھا اور کسی بات میں فرنگیوں کی ریس کا اثر یا نگوڑا کرسٹان پنا نہ تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ سارا گھر پڑھا لکھا ہے۔ بیٹے کی خاطر انگریزی اب سے نہیں بلکہ شہر آبادی سے پڑھنی شروع کردی تھی۔ اور دوسری پشت ولایت جاتے ہوگئی ہے۔ اللہ رکھے گھر والی خود پڑھی گنی اور ملوئیوں کی سنگت اٹھائے ہے۔ پر اپنی وضع کو نہ جانے دیا۔ چھوکریوں کو گھر کی وہی نگوڑے سائے نما تین تین کلی کے پیجامے پہناتی ہے۔ ناچ کو جب جی چاہتا ہے تو یہی چھوکریاں باندیاں سا یہ پہن ٹوپی اوڑھ اس مزے سے انگریزی ناچ کی نقل اتارتی ہیں کہ ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑجائیں۔ سوزنی پر ذرا ایک طرف ہٹ کے گاؤ تکیئے پر سر رکھے ایک ہاتھ گال کے نیچے اور دوسرا کولھے پر پڑا۔ کروٹ لیے۔ آدھا دھڑ سوزنی پر آدھا سوزنی سے باہر۔ ذرا پیر سکیڑے آب رواں کا دوپٹہ سر اور پیروں کے نیچے دبائے سارے جسم کو خوبصورتی سے چھپائے کچھ ترچھی سی ماہ رخ زمانی بیگم لیٹی تھیں۔ جھین جھین دوپٹے میں لپٹی جیسے جالے میں تیتری یا سفید صافی میں گلاب۔ گھٹنے کے پاس رادھا نگری کا کنتا چڑھی پانوں کی ڈبیا رکھی۔ لیٹے لیٹے ذرا غنودگی سی آگئی۔ اتنے میں سعدہ خانم گوٹے والی آئیں۔ یہ شہر آبادی میں اچھی سیانی تھیں۔ باوا ان کے قلعے میں آبدار خانے کے داروغہ تھے۔ شہر میں گدھوں کا ہل چلا۔ آدمیوں پہ بیلن پھرے شہزادیو

کی چٹیاں پکڑ کے سر بازار گھسیٹا گیا تو یہ بیچاری کس شمار قطار میں تھیں - انگریز کے نام سے دم نکلتا تھا - میاں محمد علی اور میاں شوکت علی کے لیئے دعا کرتیں کہ الٰہی انہیں عقل دے انگریز بھڑوں کا چھتّہ ہیں کہیں ایسا نہ ہو ناراض ہو جائیں اور جانے کس کس کو پھانسی پر چڑھائیں - کاغذی محلہ میں ان کا گھر خانقاہ کے پاس تھا - جب محلّہ کھدا اور خانقاہ توڑ کر گرجا بنا تو اسی کھدنی میں ان کا بھی گھر آیا - اب بیچاری گوٹہ کناری بیچتی گھر گھر پڑی پھرتی ہیں اور اسی طرح گزر کرتی ہیں - اندر آئیں سامنے سہ دری میں بی مغلانی بیکار بیٹھی اونگھ رہی تھیں - پاس کھٹولے پر ایک چھوکری بیٹھی کاج پٹی کا گریبان تیار کر رہی تھی - عمدہ خانم نے سلام کیا - بی مغلانی چونکیں اور دیکھتے ہی للکاریں - واہ بی واہ آج لاہی ہو چمپا کی تو لی - تم نے خوب راہ دکھائی - توئی بنا روپٹہ یونہی پڑا ہے - آخر جل کے خواصی میں مغلئی بیچ ٹانکنے کی میں نے توٹھان لی تھی - عمدہ خانم بولیں - بی سدا (صدا) رحمت ہے صورت دیکھتے ہی سر ہو گئیں - پہلے سن تو لو پھر کچھ کہنا - تین دن سارے بازار میں ٹھکر ٹھکر کرتی پھری کہ کہیں اچھی بنت کی توئی یا ننھی جان مل جائے یا تو دھوئیں کی رنگی ملتی ہے یا وہی نگوڑی ولائتی تار کی کہ چار دن میں مال ماند ہو جائے - ٹانکو تو آنچل پھڑ پھڑ کتنے کھڑے رہیں - اب شہر کی نہ ملے تو کہاں سے لیاؤں - سیدانیوں کی گلی میں بھی دھکے کھا آئی - اپنی بنانے سے تو رہی - اللہ رکھو بیگم کہاں ہیں -

مُغلانی - اندر ہیں -

عمدہ خانم ۔ تو چلو میں بیگم کو تو سلام کر آؤں ۔

عمدہ خانم مغلانی پاس گٹھری بُرقعہ چھوڑ اندر دالان میں گئی ۔ آداب کیا ۔
ماہ رُخ زمانی جو تکیے جلدی سے ہوشیار ہو بال ٹھیک کیئے اور بیٹھ گئیں ۔ عمدہ خانم
بھی ستون کے برتن سے کمر لگا سامنے ادب سے بیٹھ گئی ۔ ماہ رُخ نے پانی مانگا ۔ آبدار
خانے والی بنے جلدی سے تھالی جوڑ کٹورے میں آبِ خاصہ نکال سرپوش ڈھانک
تمیز سے جھک پیش کیا ۔ ماہ رُخ نے اگالدان میں اگال ڈال کلّی پیکدان میں کی اور
ڈبیا سے گلوری چاندی کی چنچی سے پکڑ نکال کھائی ۔ دُرِّعدن کو اشارہ کیا کہ
پٹاری میں سے ایک پان عمدہ خانم کو بنا دو ، اور کہنے لگیں ، ہاں بی تمھاری مغلانی
سے جو باتیں ہوئیں ہیں سب سن رہی تھی ۔ آخر مسالے پہ یہ کیا آفت آئی ہے کہ کوئی
چیز ڈھنگ کی نہیں میسّر آتی ۔ اچھا ! دو مولی چنیا بھی ہے یا وہ بھی اُڑ گئی ؟ ۔
عمدہ خانم ۔ اے بیگم واری گئی ! ان چیزوں کی اب مانگ کال ہی ہے ۔ ساری کی
ساری بیوپاری مسیح کی حواریاں بن گئیں ۔ سب نگوڑی ولایتی سفید جھنّی دھجیوں پر بکتی
ہیں ۔ ہر طرف ہل ۔ فیتے اور چینٹوں کی پکار ہے ۔ گوٹے کناری کو کون پوچھتا ہے ۔
بھاگ بھرے انگریز ۔ ان کا لہنا ۔ ٹہریاں ہندوستانی بیلیں اور بیسیں اُدھر کھنچ جاتے
مسالہ تار تر نگا بھی ہوتا ۔ تو چار ٹکے کھرے ہو جاتے ۔ موٹی سوت کی دھجیاں آئیں
باپکے مول ۔ بیچو تو کوئی دمڑی کو نہ پوچھے ۔ اِسی کا نتیجہ ہے کہ سارا اٹکا کال
مارا اور نگوڑے دیسی کنگلے ۔ دو اُنگل کی لنگوٹی تک نہ رہی ۔ ایک ہاتھ آگے

اور ایک ہاتھ پیچھے۔ چاہے کسی دھاڑے پہنچیں گھر جلے بلا سے۔ شیخی تو بغل میں ہے۔ ایک تو خود بیویوں کی رعنت اس طرف کم دوسرے بیگم جہاں کندلہ گلتا ہے وہاں انگریز کا پہرہ بیٹھ گیا ہے۔ اس لیئے کندلہ اب کم گلتا ہے۔ تارکش الگ حیران۔ دبکیئے جدا پریشان۔ سارا مال ولایت سے آتا ہے اور نرا کھوٹ۔ کرخندار (کارخانہ دار) ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ جو نوکر پیشہ ہیں۔ اُنھوں نے ہی ہُڈ ڈالی۔ تنخواہ بڑھاؤ۔ تنخواہ بڑھاؤ۔ انگریزوں نے تنخواہ کڑاجی کرکے بڑھائی پر بیگم نت نئے ڈنڈ اور لگان لگا دیئے۔ کرایہ بڑھا دیا۔ ہوا تک پر تو محصول لگا دیا بیگم کھڑکی کھولو تو راج ڈنڈ بھگتو۔ تنخواہیں بڑھیں تو کیا، میاں کی جوتی میاں کا سر رہا۔ پیسے میں چار سودے آتے تھے۔ اب آنے میں بھی جنم جلی چیز نہیں آتی پہلے پیسہ کا یہ ڈھکن سا گھی آتا کہ تین تر تراتے پراٹھے اُتار لو۔ اور اب گھی کھانا تو کیسا۔ گھی کا غم کھاؤ۔ دو آنے کا بھی منگاؤ تو اللہ رکھے راج کی بدولت وہ برکت کا آوے کہ دیکھ کے جی ہی خوش ہو جائے اور دل سے دعا نکلے کہ "جگ جگ رہے فرنگی راج" بزاروں میں روشنی۔ موئی سڑی سڑی گلیوں میں بجلی کی روشنی ہائے بیگم گھروں میں ہمارے اندھیرا ہو گیا۔ دمڑی کا تیل نہیں جڑتا۔ دھڑیں ڈلیں یا چراغ میں جلائیں۔ سرکار آلٰہی ہزاروں پہ ہاتھ رہے۔ سینکڑوں کو کھلاوے جس تنگی ترشی سے ہماری بسر ہوتی ہے اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتیں ورنہ اللہ کرے وہ نوبت آئے جس سے ہمارے دُکھ کا دشمن اندازہ کریں۔ مہاتما جی کہتے تو ہیں

کہ نوکری چھوڑ دو۔ نوکری چھوڑ دو۔ اے بیگم اول تو چھوڑتا کون مسخرا ہے اور جس کسی کا سر پھرا۔ مذہب کا خیال آیا اور نوکری سے اُس نے ہاتھ اُٹھایا۔ خانہ آباد دولت زیادن، "تو نہیں تو بھائی۔ تین لاکھ تیرے اور بھائی۔ بیگم فرنگی کا رونا کیا روئیں۔ اپنے آپ ہی ٹھیک نہیں۔ سارا پنجاب قبضے میں ہے اور سب سے زیادہ یہی اپنے کلمے کے شریک بھائی۔ اپنے دام کھوٹے پرکھنے والے کا کیا دوس۔ سارا روپیہ ولایت کھنچا چلا جا رہا ہے۔ یاں نگوڑی جوار کی بھی پیٹ بھر کو نہ ملے، واں اللہ کے قربان جاؤں۔ نان پاؤ اور مکھن اُڑائیں اور یہ بیویاں اور تیار کر رہی اور سنڈ مسنڈ بنا رہی ہیں کہ ہاں موئے سانڈوں کھاؤ اور پھر ہمیں ہی ٹکرانا۔ لو روپیہ ہم سے اور کرو اپنی کمر مضبوط۔ جمع جکڑی ہم سے لو اور خوب تیز تیز ہتھیار بنانا۔ پھر اُن سے ان بندیوں کو ذبح کرنا۔ چھریوں کے غسل ہمیں نہ دینا۔ ہماری اور بیسیوں بہنیں ہیں دل کھول کے مسجدیں اور مزار ڈھانا۔ کھلے میدان نکالنا۔ گجھ پچ مکان اور پیچ در پیچ گلیاں کس جوگی۔ نہریں بہتے بخار۔ درخت روگوں کے اڈے۔ صاف صاف صفا چٹ میدان چلچلاتی دھوپ میں جو مزا ہے وہ کسو میں نہیں اور بیگم ایمان کی تو یہ ہے کہ ہم تو پیٹ کے کتے ہیں ہمیں تو جس دھندے میں چار پیسے جھڑتے نظر آئینگے وہی کرینگے۔

ماہ رخ زمانی۔ اے بی ہم ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہمارے توکل کے کل ہندوستانیوں پر بھی اللہ میاں کی رحمت ہے۔ دوزخ بھر دو اور چاہے تو بہ توبہ نعوذ باللہ کعبہ ڈہوا لو

سب سے آگے ہی کلمہ گو موئے۔ وہ تو یوں کہو کہ یہی غنیمت ہے کہ انگریز خود ہی ان نگوڑوں کے منہ پہ نہیں تھوکتے اور ذلیل سمجھتے ہیں جو کہیں ذرا منھ لگائیں پھر تو جو نہ کرنی ہو یہ کر ڈالیں۔ اچھی! کوئی خطاب دیدو! جاگیر دیدو۔ کسی عہدے کی امید دلا دو پھر ان نامرادوں سے مزارِ پاک تک کے کوڑے کرالو۔ انگریز اپنے دم سے بڑے ہی شریف۔ میرا منہ نہیں جو تعریف کرسکوں۔ پر کیا کریں یہاں کی ہوا سے لاچار ہیں۔ ہنس ہنس کھائیے پھوہڑ کا مال۔ جب یہی آنکھوں کے اندھے داموں کے پورے ہوں تو آتا دھن کسے بُرا لگتا ہے۔ عقل کے پتلے ہیں جو بات کرتے ہیں سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ ہر بات میں اپنا پہلو ضرور رکھ لیتے ہیں۔ کوئی ہندوستانیوں کی طرح باولے تو ہیں نہیں کہ اپنا سوچتا نہ کریں۔ ہماری وہ نوبت ہے جیسے پنجرے کا قیدی۔ بازو شل اُڑنے کا سکت نہیں۔ کسی کو رحم آیا۔ اس نے آزاد کرا۔ اگر ہمّت کر کے جست کی تو باز، بہری جھپٹی۔ مالک کو بہانہ ہاتھ آیا۔ کہ میں نے تو اسی لیے حفاظت سے رکھا تھا کہ کوئی ظلمی کھا نہ جائے۔ پھر لیا پکڑ بند کیا، یا پشتینی قید کے ایسے عادی ہوئے کہ اگر بیزار ہو پنجرے سے نکالا بھی تو میاں ٹوٹرو پھر پنجرے ہی میں گھسے جاتے ہیں کہ کیا ہی دل تو بے فکری سے رہی ہے۔ چاہے آدھی بھوک کیوں نہ ہو۔ قید اسے کون دیوانہ کہتا ہے۔ ہم نے تو جنم اسی ہی میں لیا۔ موا گندگی کا کیڑا گندگی ہی میں خوش رہتا ہے۔ اس سے باہر اس کی موت، انگریزوں نے چھوڑ دیا تو غضب ہی ہو جائیگا ایک کو ایک کھا جائیگا۔ ہائے کیسے بیلے ہو گئے۔ نگوڑے

ڈوب مریں۔ جوڑیاں پہن گھروں میں بیٹھی رہیں چٹیے ڈنڈھریں یا رتے وصول کریں
کیسی تن آسانیاں بڑھ گئی ہیں۔ گاندھی مہاراج تو گاڑھے کی کہتے ہیں اُنھیں تو ٹاٹ
کمبل چاہیے جو زناں پن نکلے اور یہ حرام ڈیل محنت کا خوگر ہو۔ میں تو خدا لگتی کہتی
ہوں۔ خاطر کی نہیں لیتی۔ انگریز یہ حرف گیری کرنے کا ہمارا مُنھ نہیں۔ اپنے گریبانوں
میں مُنھ ڈالیں رائی کا پربت بنا کے لگائی بجھائی کرنے والے۔ کرسی پہ بیٹھنے کی
شوق میں کیا کچھ نہیں سنکار آتے۔ بس ان بپتانیوں سے اللہ ہی سمجھے۔

عمدہ خانم۔ اے بیگم امزار کی کہن یہ ایک بات یاد آئی۔ اب ان جگاہوں کا تو
کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہندوؤں کا تو دل چل گیا ہے۔ مہاتما جی نے رہا سہا اور
سب کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ اُن سے نہ ہندو بچے نہ مسلمان جانے ان میں کیا ایسی
موہنی ہے اور کون سا لٹکا انھیں یاد ہے سارے ملک کو اپنے سے ملا لیا ہے۔ اب انگریز
کو دھمکی دیتے ہیں۔ سوراج دو۔ انگریز بے چارا ایک نہ دو اکٹھے سوراج تجھے
کہاں سے گھڑ دے۔ بھیا دیوانے اندر پت مانگ لے۔ کامروپ لے لے۔ بنگال
دیس لے لے۔ مندر راج کا حاطہ لے لے۔ اور ہاں چینبل پار بائیوں کا ملک وایس
لے لے۔ یہ سب مل ملا کر کُلّھم پانچ ہوئے تجھے چاہیئے سو۔ تو کیا لندن پہ دانت
ہے۔ چلو انگریز نے رفع شر کیا۔ لندن بھی دے دیا۔ اور باقی کے کہاں سے لائے؟
وہ نیک ذات فرنگیوں کی بارہ ٹوپیاں ہیں سب مل کے بھی بھیک مانگیں۔ مانگنے
کے انھیں سب ڈھنگ یاد ہیں تب بھی سوراج نہیں دے سکتے۔ مہاتما جی تو

سٹھیا گئے ہیں۔ نو دس برس انگریز کی حکومت کو ہوئے...

مُغلانی (گھبرا کے) اے بی توبہ کرو۔ مہاتما کی شان میں ایسے گستاخی کے کلمے نہ کہو۔ منھ سے بو آنے لگے گی۔

ماہ رُخ زمانی - (ہنسی کو ضبط کر کے) اے بی عُمدہ خانم! یہ انگریزی راج کو نو دس برس کیسے؟ -

عُمدہ خانم - اے بیگم! ایسے - شہر آبادی تک تو خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا تھا ہی۔ یہ اب سے تین بیسی بیتے کی بات ہے۔ کمپنی بادشاہ کی نوکر تھی اور بادشاہ کی طرف سے حکم احکام جاری کرتی تھی۔ اٹھارہ صوبوں میں بادشاہ کا سکہ چلتا تھا سات ولایتوں کے وکیل حاضر رہتے۔ چھپن تلک دھاری راجہ واٹیاں چرن بردی کرتی تھیں۔ لندن کی رانی جانے کس رشتہ سے بہادر شاہ غازی کی بہن بنیں قلعے سے اشتیاق نامے ہمشیرہ اور جانے کیا کیا محبّت کے لفظ لکھ کر بھیجے جاتے اور وہاں سے جانے کیا کیا لکھ کر آتا۔ غرض یہ کاغذی گھوڑے اوپر اور پروانے اور ان چٹھی چپاٹیوں میں کیا کیا نہ کچھ طے ہو گیا۔ بنتی کمپنی کی فوج بگڑی نگھوڑے نگوڑے شہر میں گھس آئے۔ نہ کل سن نہ آج سن۔ بیگم یہ عجب تریوں کا نام ہے سشتر و محرّم کی پیدائش کوئی انگریز تھا اُس نے جھنڈو باؤ لے سکھوں کو

ـــہ امی جمی کا زمانہ جب کہ اسلامی حکومت دلّی میں تھی، انگریزی راج سے پہلے کا زمانہ شہر آبادی کہلاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا زمانہ دلّی کا زمانہ بہادر شاہی دور ہے۔

جما کیا اور شہر پہ لے دوڑا۔ پٹیالے کپور تھلے والوں کو اپنی بیٹیاں دے انھیں بھی ملا لیا۔ پنجابیوں اور سکھوں کو جانے کاہے کی شہر والوں سے پرخاش تھی اور دلّی والوں پہ اُدھار ہی کھائے بیٹھے تھے۔ کچھ نامراد ناشاد شہر والے بھی مل گئے۔ انگریز کو داخل کر لیا۔ اب کیا تھا خوب دھڑی دھڑی کر کے لوٹا۔ اُن ہونے ظلم انگریز نے توڑے۔ جہاں پناہ کی بدلی قلعے سے رنگون کر دی اور یہ خونی للوٹے رستہ گھیر کے اور رنگون کے بیچ میں کلکتہ پہ جم بیٹھ گئے۔ جو کچھ گوروں اور پنجابیوں نے شہر والوں پہ ستم ڈھائے ہم نے سب اُٹھائے۔ چُپ کی داد خدا کے ہاتھ۔ اِس کی تھوڑی سزا لاہور اور امبرسر والوں نے بھگتی۔ لیکن بیگم! ہماری مصیبت کا لاکھواں حصہ بھی اُن کی بپت نہ تھی۔ غرض بیگم! کمپنی پہ لندن کی رانی کا غضبی خانہ اترا۔ آخر کو کچھ بھی تھی۔ تھی تو رانی بات کا پاس، اُس نے کمپنی کا کھوتڑا ہی کھو کے چھوڑا اور کلکتے میں اپنا انگریز بٹھا دیا۔ شہر تو بیگم! سارا اُجڑ ہی گیا تھا، محل، حویلیاں کُھد کُھدا کر برابر ہوئیں۔ یہی حال قلعہ کا ہوا، دو چار عمارتیں قلعہ میں رہیں۔ وہ ایک شہر میں بستے بستے بھی عرصہ چاہیئے۔ پھر ہاں بیگم! رانی مسلمان ہو گئی ملکہ کہلائی اور سب کی پرورش کی۔ بڑھیوں، ٹھرّیوں، محتاج، اپاہجوں کا روپیہ روپیہ دو دو روپیہ مہینہ کر دیا، اور جتنے بادشاہ سلامت کے بھائی بند تھے سب کا فراخ دلی سے پانچ پانچ روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ بیچ میں کئی دفعہ شہر کی حالت دیکھنے کو اپنے لاٹھ بھیجے۔ بیٹے کو بھیجا۔ پوتے کو بھیجا۔ لیکن شہر تو

بستے ہی بستا اور جمتے ہی جمتا۔ اب اب کرکے ذرا سی جمی ہوئی اور رونق پکڑی تو بیگم، ہمارے بادشاہ جہ جبین نجم نے کہا کہ میں حکومت اپنے ہاتھ میں لوں گا، دادا حضرت بہادر شاہ کا تخت میرا ہے۔ اللہ رکھو وہ آئے، دلّی میں دربار کیا گیا، تاج سر پہ رکھ، بادشاہ ہو گئے۔ اور دلّی راج دھانی جیسے پہلے تھی، پھر ویسے ہی ہو گئی۔ اور، بیگم! وہ تو قلعہ ہی میں رہتے، جم ہی جم سدھارتے کیونکہ ملکہ مریم زمانی میری محل کو ساتھ لے کے آئے، لیکن محلوں کے سامنے للوؤں کی بارکیں دیکھ جی اُچاٹ گیا اور حکم دیا کہ ارے ہاں رسے نئی لال حویلی بنائی جائے۔ اب یہاں سارے اوپر والوں کے پیٹ میں چوہے دوڑے کہ بڑا غضب ہوا، جہاں پناہ یہاں آ رہے تو غضب ہی ہو جائیگا۔ جو اب ہماری عزت اور دھوس ہے، بادشاہ کے مقابلے میں پھر ہماری کیا قدر و منزلت رہیگی۔ شہر والے تو اڑنے لگنے اور درباری ادب آداب سے واقف ہیں، یہی منہ چڑھ جائینگے تو بنائے نہ بنے گی اور ہم ازار کی ریح سے بدتر نکھر ہو جائینگے۔ کشمشی دن کی ڈالیاں اور ہر بدھ کے چابک چابک لونڈے کہاں سے پیسہ آئیں گے۔ غرض بادشاہ کو جانے کیا سنکارا کہ وہ نئی لال حویلی، جو بڑے بازار اور لال ڈگی کا حکم تال کٹورے کے پاس تھے اصل خیر سے سدھارے۔ اور شہر کو ملکی لاٹھیہ چھوڑ گئے۔ آپس ہی میں مل ملا، جوڑ توڑ کر لاٹ صاحب کے دشمنوں پر گولا پھنکوایا۔ اللہ نے بال بال و سیرانی کو بچایا۔ لاٹ صاحب زخمی ہوئے، پر صدقے اس کی کرمی کے جان پر آنچ نہ آئی

انھیں بدعیوں نے تو بادشاہ کے دل میں فرق ڈلوانے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی، کچھ یوں ووں ہو جاتی تو سب کا منھ کالا ہوتا۔ اچھی کی خدا نے، بُری کی بندے نے کھلائے کا نام نہ ہوتا، رلائے کا نام ہوتا۔ بہتیرے تاویذ (تعویذ) گنڈے ہوئے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے ایسا ایک پیرا ایک نقش بھیجا کہ پلک جھپکاتے میں پلنگ کو لات مار کھڑے ہو گئے۔ انھیں پھر بھی شہر والوں کا بڑا خیال تھا، ویسرائی نے صدقے کا سارا روپیہ، کوئی ہزار بارہ سو ہوگا، حکم چلی کم نصیب شہزادیوں کو دے دیا۔ کیا، بیگم! اللہ کی شان ہے، انھیں بادشاہزادیوں کا ایک وہ زمانہ تھا کہ یہ سلام لے لیں تو بڑی عزت سمجھی جاتی تھی اور جن کی ڈیوڑھیوں پر چکن پہنے، جریب لیے، پگڑی سر پہ دھرے، کمر باندھے کھڑے رہنے میں چار جانتوں میں بڑی آبرو سمجھی جاتی اور آج ان کا سلام لینا کوئی گوارا نہیں کرتا۔ جنھیں گھنٹوں ان کے سامنے مجرا اور کورنش بجا لانے کو کھڑے رہتے تھے، سو، بیگم! جب انگریز نے یہ دیکھا کہ یہ داؤں بھی نہ چلا تو کھل کھیلا۔ ستیاناسی نے شہر کی صفیلیں تڑوانی شروع کیں، گھونگھٹ دروازوں کے اٹھوا، شہر کو رویت سے بے رویت کیا۔ چاندنی چوک کی نہر جو جنت کا چشمہ تھی اور دونوں طرف جنگلی جنگلی عالی شان تھرگھیرے، مولسری، آم، گولر، بڑ، بیل، گل مہر، کچنال کے درخت تھے، ان کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں سے راہ چلتے آرام لیتے۔ پہلے تو نہر تڑوا بھری بنوا دی۔ چلو یہاں تک بھی خیر گزری۔ شہر والے بھی کاٹیاں، انھوں نے

کیا کیا کہ اس پر مینا بازار لگایا جاکم کو یہ بھی نہ بھایا۔ نت نئی آن سنی بیماریوں کے
شیشے اپنے پادریوں سے آدھی رات کو شہر میں چھڑوائیے۔ وہ لے دے اور
تڑا تڑی کا بازار گرم ہوا کہ تو چل اور میں آیا۔ سارا الم ہرے چھال دار دَرختوں
میں دھرا گیا۔ بڑی بیگم کے بٹھائے درخت، پیسے کے لالچ بے دردی سے کٹوا،
ٹھنی ٹھنی اور گدّا گدّا الگ کر جنگل بیابان کف دست میدان، موئے سیوڑے
کرزن کی صورت بازار کر دیا۔ اب جیٹھ اساڑھ کی گرمیوں اور چلچلاتی دھوپ
کہ چیل انڈا چھوڑے، صبح پانچ بجے سے جو اس بازار میں بھرتی ہے، تو ساڑھے
چھ بجے شام تک بلکہ چراغوں جلے تو ڑی، بزار فرنگی لہار کی بھٹی بنا رہتا ہے کہ
آدمی ایک دوکان سے دوسری دوکان پر جائے تو تڑا خا کھا کے گرے اور
چھرہ پھرہ سب جھلس کر رہ جائے۔ الٰہی ٹوٹیں ظالموں کے ہاتھ میں نارو پھوٹے
اُن کی گرمی اور تن تن سے کوڑھ چوٹے ملکیا بزار کو ملیا میٹ کیا ہے۔ ادھر دیکھو
وہ مارے ناگہانی موئے دجّال کی سواری ٹن ٹن کرتی، ٹریم گاڑی در و دیوار
پر لرزہ ڈالتی، کانوں کے پردے پھاڑتی چلی گئی۔ ادھر دیکھو موئے شہدوں،
بے شرموں کی سواری پوں پوں پر پر کرتی موٹر گاڑی اپنی جان پر خاک
اُڑاتی، راہ چلتے بھلے مانسوں کو بھول بھتا کرتی، زراے کے پول کی طرح
سر سے نکل گئی۔ نالکیاں، پالکیاں، رتھ انباریاں خاب ہوگئیں۔ چھم چھم کرتی
ساٹڑنیاں جیسے اندر کے اکھاڑے کی پریاں، چلنے میں جن کی گت۔ آرجا رجنکی

ناچ کی محفل، تام جھام، پوچھے، ہَوا دار، بزار کی گھما گھمی، کہاروں کے ہنکارے سب ہَوا ہوئے۔ اب نگوڑے بازار میں نکلو تو گھر سے خطا بخشوا کے۔ ایک قدم دھرا دوسرے کی خبر نہیں، بجلی کے تار سر پر۔ قدبرابر بجلی گرے، کوسنے کی کوئی حقیقت ہی نہ رہی۔ بجلی کے قمقمے معلوم ہوتا ہے کہ غارتی تارے توڑ لائے ہیں۔ گیس کے ہنڈے سوا گز نیزے کی بلندی پر حشر کے میدان کا فرا چکھاتے ہیں۔ خریدار رہو تو ہوش، کا فرکرتی۔ اونی ٹاٹ کی کچھنیا پہنے، چرنا ٹوپی منڈھے، ادھر سے اُدھر نکل گئے۔ نہ سلام نہ مجرا، نہ خیر نہ خبر، ایک نفسا نفسی۔ پہلے سی کوئی بات ہی شریفوں کی سی نہ رہی۔

ماہ رُخ زمانی۔ [اُکتا کے] اے بی، ہاں تو پھر انگریزوں نے جب بادشاہ چلے گئے تو کیا کیا؟۔

عُمدہ خانم۔ بیگم کرتے کیا؟ اس وقت سے نت نئی اڑچنیں کھڑچنیں نکالتے چلے جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ رعیت اور بادشاہ میں اَن بَن کرادیں۔ بادشا کا دل رعیت کی طرف سے میلا کرادیں، موئے بلا کے ہیں۔ ہاتھوں لگائیں، پیروں سجھائیں۔ مہاتما گاندھی جی اور سب مولویوں کو لگائی بجھائی کر اور بادشاہ کے نام سے ظلم توڑ، ننگی شمشیر میاں شوکت علی اور میاں محمد علی کو بھی اُکسا دیا۔ اَدبدا اَدبدا کے ایسی باتیں کرتے ہیں کہ جن سے دل پھٹیں، خلیفہ کے خلاف شریف مکہ کو کیا۔ سارے پاک مقاموں میں اس طرح گھس گئے جیسے

جامع مسجد کے آثار شریف میں جوتے پہنے، بے پاکی، بے طہارت گھس جاتے ہیں۔ سنتے ہیں، کان گنہگار ہیں کہ توبہ توبہ، نعوذ باللہ کونسلوں کے جو مسلمان ممبر ہیں وہ تو اس پر راضی ہو گئے۔ اے ہے، بیگم، قیامت آ جائیگی۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔ جانے کیا اُن کے سر میں سمائی ہے جو ایسی اُلٹی اُلٹی سوجھتی ہے۔ کبھی تو اس کی چونپ اُٹھتی ہے کہ سلطان روم خلیفہ اسلام کو اپنے قبضہ میں رکھیں اور جس کل چاہیں نچائیں اور زور توڑتے توڑتے واجد علی شاہ اور بہادر شاہ کے دہاڑوں کو پہنچائیں۔ استمبول میں قدم جما ہی لیئے ہیں۔ الٰہی دلی والوں کی سی درگت ترکوں کی نہ ہو! مولا تو ہی اپنے دین کا حافظ ہے، جانے اُن کو کیا ہو گیا ہے۔ دین کا خوف ہی نکل گیا ہے۔ مارے طمع کے دیوانے ہو گئے ہیں کچھ سٹھیا ہی گئے ہیں اب یہ کون سی عقل دندی تھی کہ کسی چلم بھوڑ لاٹھ نے شملہ پہاڑ پر ایک بل بنایا اور کہا کہ رولٹ اس میں گھُس۔ بھلا کون گھستا؟ سب نے انکار کیا۔ گولی چلوا دی۔ بھرے چاندنی چوک میں وہ اولوں کی طرح گولیاں برسائیں کہ سب کا ستھراؤ ہو گیا۔ بھر بھر لاشیں گاڑیوں میں دریا برد کیں۔ یہی حال پنجاب میں کیا۔ پیٹ کے بل چلوایا۔ بھرے بزار میں جوتڑوں پر تازیانے بجائے اور بچارے بادشاہ کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ تتو تھمبو، لیپا پوتی کرتے رہے۔

ماہ نسخ زمانی۔ وہ تو بتاؤ کہ انگریزی راج کو دس برس کیسے ہوئے ہے؟

ہم نے تو جب سے آنکھ کھولی انھیں کو دیکھا۔

عمدہ خانم۔ بیگم، دیکھنے کی ایک ہی کہی! خواب میں وہ دیکھتے ہیں جو ہوتا ہوتا تھا کہ
نہیں۔ انگریز کی اصلی حکومت تو دلّی دربار سے شروع ہوتی ہے کہ بادشاہ آئے اور
ساری راجہ واڑی اکٹھی ہوئی، اکبر کا سا دربار لگا۔ نہیں تو بیگم، اس سے پہلے
تو نرے محصّل متصدی تھے اور اس دربار سے پہلے جو کچھ منڈے کرزن نے
ہاتھیوں کا دربار کیا تھا، اِس تک میں اس بات کا ادب رکھا کہ نشیمن ظلّ الٰہی
میں نہ بیٹھے، بلکہ ہر تس بگی کے چبوترے پر کرسیاں ڈلوا کے دربار کیا۔ نشیمن
میں بیٹھنے کی مجال نہ ہوئی۔ ایسے بادشاہ ہوئے تو بیٹھے۔ ادب آداب بھی
کوئی چیز ہے۔ سات سمندر لانگ پھلانگ کے بندروں کی فوج لے آئے۔ بسا کر کے
دس برس راج کر لیے گزرے کہ گاندھی کی آندھی چلی، مہاتما جی گویا رکا ہوا
دس برس کے راج کا سود، سوراج مانگتے ہیں۔ شہر کے بالشٹر، حکیم بھی اُن کے
مل گئے اور باہر کے پڑھے لکھے بھی مہاتما جی کی تپنی جپنے لگے، البتہ بیگم!
مسلمانوں نے اب کے ذرا ہشیاری کی۔ راج تو جانتے ہیں آپس ہی میں تھے
سارے ڈیل میں زبان حلال جس سے ایک دفعہ منہ بولا رشتہ قائم کر لیا،
بس پھر وہ اپنا ہی عزیز قریب ہے، جب جلیں تم کوئی غیر تھوڑی ہیں، مسلمان
ایک ذری سی چیز مانگتے ہیں اور اس میں سارا جہان آگیا۔ میاں محمد علی
شوکت علی، بڑے حکیم صاحب (مسیح الملک حافظ اجمل خاں صاحب) جہانگیر نگر

والے سید حسین جو انگریزی کے نہین حرفوں کا اتنا بڑا اخبار نکالتے ہیں نواب محسن الملک کے بھتیجے سید بدرالحسن میاں، ایسے ہی میاں آصف علی بیلسٹر خواجہ محمد یوسف وکیل کے بیٹے میاں خواجہ مجید بیلسٹر، ڈالی باغ والے جو لکھنؤ کے وکیل ہیں، ہیں نا۔ میاں محمد نسیم اُن کے بھانجے خلیق میاں اور ڈھیر سارے مولوی اکٹھے ہوئے۔ سب نے مل کے مسکوٹ کی اور کسی نے اس کی بھنبھنی بھی نہ پائی۔ یہ فیصلہ ہوا کہ انگریز سے کچھ نہ مانگو، بس ایک چیز مانگ لو اور انجیل اُٹھوا لو کہ قول سے پھریں تو اپنے مسیح سے پھریں اور دعا کریں تو خدا اسے پائیں۔

عمدہ خانم یہ باتیں کر رہی تھیں اور ساری حویلی کی نوکریں دالان میں اُن کے گرد جمع تھیں، بڑے شوق اور استعجاب سے عمدہ خانم کی باتیں سُن رہی تھیں ماہ رُخ زمانی خود پڑھی لکھی تعلیم یافتہ تھی۔ لیکن وہ بھی یہ باتیں بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی اور مزا لینے کو ایک نہ ایک بات خود چھوڑ دیتی، ہر بات سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتی۔ کہتی کہ بی عمدہ خانم، لو ہمیں خاک کچھ خبر نہیں کہ باہر کیا کچھ گزر رہی ہے۔ عمدہ خانم تھرک تھرک کے اور اترا اترا کے باہر کی خبریں سناتیں اب بی عمدہ خانم اس تمنا میں ہیں کہ ہر ایک اُن کی خوشامد کرے اور پوچھے اچھی! پھر وہ کیا چیز تھی جو سب بڑے بڑوں نے مِل کے مانگی اور پھر اتنی مسکوٹوں کے بعد۔ آخر جب سب نے بہت خوشامد کی تو کہنے لگیں "ووٹ! دماغ

چاٹ لیا۔ میں تو تھک گئی۔ کب سے بک بک کر رہی ہوں۔" بی دار وغن بولیں۔ "اچھا! خالہ، لو زردے کا ٹکرا کھا کر تازہ دم ہو جانا اور پھر سنانا۔" یہ کہہ جھپ سے ایک پان زردہ اور چھالیا کا چورہ ڈال مسل، عمدہ خانم کے حوالہ کیا۔ عمدہ خانم نے ایک آدھ مسکوڑا کھا، دوپٹے کو سر پر سے ہٹایا، کرتے کی الفی گریبان کی گھنڈی کھولی اور ہنسلی کی ہڈی پر سوکھی سوکھی جھریاں پڑی انگلیاں پھیر کہا۔ "اے ہے ابھی سے بلا کی گرمی پڑنے لگی ہے۔"

تم سب نے اور دل کے میری جان یہ نرغہ ڈالا ہے۔ ذرا پرے ہٹو۔ چلی چلی آتیاں ہیں، بلا کی تریوں، ساری سہاگ لہر روک لی، مرا دم بولایا جاتا ہے۔" ماہ رخ سب یہ بڑی بی کے نخرے دیکھتی رہی۔ آخر کو کہا "ہاں بی عمدہ خانم، وہ کیا چیز تھی؟"

عمدہ خانم۔ بیگم تھی کیا۔ سب نے کہا بس فرنگی سے قبرستان مانگ لو۔ فرنگی نے حامی بھر لی۔" آتو جی نے جو سنا کہ مسلمانوں نے قبرستان مانگا ہے تو ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہا کہ "وہاں بیچارے اور کیا مانگتے۔ یاں تو مرنے کے بھی لالے ہیں، پچیس سے کم میں سر دادا نہ ملے، اور وہ بھی ایسا کہ جہاں برس دو برس گزرے اور کسی دلی خنگر نے خبر نہ لی، گور کند نگوڑوں نے لیں اور ہڈیاں نکال پھینکیں۔ نشان برابر کیا پھر اُدھر اسی گڑھے میں لا دبائیں۔ ہندوؤں کے کیا کہنے! اُن کے بڑے حوصلے، سوراج چھوڑ سنسراج چاہیں۔ ان کی

سب بن آٹھنگی، اُن میں ایکا ہے اور ایک کا ایک کو درد نہ بیگانی تہذیب دیکھ ان کے
دیدے پھٹیں اور نہ پرائی ریس میں یہ مرٹیں۔ اپنی مرجاد پہ جان دینے والے
اور اپنے بڑوں کی آن تان پہ مٹنے والے ہیں۔ آج تک کوئی ہندنی کالی چماری
بنتے نہیں دیکھی اور مسلمانیاں تو رنگ سے لاچار ہیں۔ کیا کریں منہدی منہ پہ نہیں
رچتی، ورنہ یہ تو منہ لال کر کے پوری حرص کریں۔ یہی نگوڑے مسلمان مرد و زن
کا حال ہے کہ اپنے طور طریقے چھوڑتے جاتے ہیں اور اپنی پرانی باتوں سے شرماتے
ہیں۔ یہ سب کے راج مانگتے۔ اُن کے تو جو گھر کے ہیں وہ چھٹتے جاتے ہیں۔ ہاں مرنے
کے دن قریب ہیں۔ ہائے قبر بھی مانگے سے ملے! ان دھاڑوں کو پہنچیں"
عمدہ خانم۔ بوا تم سمجھیں نہیں۔ اس میں بڑی باریکی ہے۔ اب جو انگریز نے
سوچا ہے تو ہوش اُڑ گئے۔ وعدہ کرتے تو کر لیا، بیگم ہے کوئی ایسی جگہ جہاں جہاں
مسلمان نہ مرتے ہوں؟ شہر کے اندر ہزاروں قبریں اور مزار، رحیمہ سحیمہ، شاہ تر
کمان، جیلی قبر، سید بھرے بھرے، سید بھورے، حضرت کلیم اللہ، شا جانا بادی،
حضرت پیر بیبا بانی، سارا قلعے تلے کا میدان، باہر شہر کے حضرت خواجہ باقی بلا
قدم شریف، کلو کا تکیہ، بخشو کا تکیہ، مہندیاں، پرانا کوٹلہ، سلطان جی میں
یہاں سے وہاں تک ایک چھت قبریں ہی قبریں، سارا چونسٹھ کھمبا، ہمایوں کا مقبرہ
منصور کا مدرسہ سارا، قطب صاحب، حضرت رسول نما، اجمیری دروازہ کا
مدرسہ، یہاں سے وہاں تک شہر کے باہر ساری زمین قبروں ہی قبروں سے پٹی

پڑی ہی اور پھر کون سی جگہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کے مُردے نہ گڑے ہوں؟ کعبہ شریف، مدینہ شریف، پیران کلیر اب اپنے قول مطابق ایک جگہ نہیں لے سکتے اور نہ یہاں گولے پھینک سکیں، ان پر قبضہ کریں تو اپنے عیسیٰ مسیح سے پھریں، دیکھا، بیگم سارا جہاں دوسرے مانو کر کے مانگ لیا۔ ایک ایک قبر سے قیامت کے دن ستر ستر ہزار مُردہ اُٹھیگا۔ بھلا کیا ٹھیک ہی، بیگم، ستر ہزار کی مولوی کہتے ہیں، پر اُن کی کس بات کا ٹھیک، یہ تو یہودیوں کے ربّی ہو گئے جو دنیا کے لالچ میں توریت کے معنی بدل دیتے تھے، یہ اب باہر والوں کے دباؤ اور دولت کے چاؤ میں حق چھپائیں اور جھوٹے فتوے دے دیں یا ایسا مسئلہ نکال کھڑا کریں جو آپس ہی میں خوب جوتی پیزار ہو اور اپنی اپنی جندیا کی فکر میں سب مصروف ہو جائیں، خیر، بیگم، اب انگریز بڑا پریشان ہی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ قول ہار چکا ہی اور یہ بات سوجھی بڑے حکیم صاحب کو، اُنھوں نے سوچا زہر کو زہر مارتا ہے۔ یہ جیسے پھر زمین مانگ ملک بھر کے مالک بن بیٹھے۔ اُن سے اب ایسی ہی چال چلنی چاہیئے۔ کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے، قبرستان مانگ لیا۔ بیگم مسلمان تو ایسے جوشیلے ہیں کہ جہاں قبریں نہ بھی ہونگی وہاں کٹ کٹ مرینگے گڑینگے۔ اور اس طرح قبضہ بڑھاتے ہی چلے جائینگے۔ یہ اوپر والے اِس گھات میں ہیں کہ کچھ ایسا پیچ لاکے ڈالیں کہ اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے شیطان کے کان بہرے، دُور پار، بادشاہ اور رعیت میں چل جائے۔

کل سیاہ سفید کا اختیار اپنے ہی ہاتھ میں لے رہے ہے۔ بادشاہ کے چچا حضرت کوڑی وَک کا بھس بھروا، لو الائے اور کاٹ کے پتلے بنا اندر کل پرزوں سے لیس کر کرا لا کھڑے کر دئیے۔ بھلا وہ اِن سے کیا خوش ہوتے، نہ سلام ہوا، نہ مجرا، بڑے رنجیدہ ہو گئے ہیں، دیکھئے کیا ہوتا ہے!
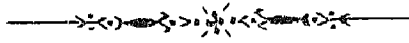
رقیہ سرخ پوشوں کی گلی میں کرائے کے چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔
جمیل اور ماہرو میں کچھ مار کٹائی ہوئی۔ ماہرو ایسی بلبلا کے روئی کہ ماں گھبرا
گئی۔ سلائی کے کپڑے یوں ہی چارپائی پہ پھینک، جلدی سے جوتی میں
پاؤں ڈال کے بیٹے کو مارنے بھاگی۔ جمیل بیٹا ذات۔ بھلا وہ کیا ہتھے چڑھتا
بہن کو مار۔ باہر گلی میں نکل گیا۔ یہ بھی جلدی سے دروازے پہ پہنچی۔ دروازے
پر پھٹی دری کے پیوند لگا ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ مارے غصّے کے آدھے سے
زیادہ دھڑ باہر نکال دیا۔ اور لگی بیٹے پہ گرجنے برسنے۔ اوہیے موئے
او داڑھی کے باوا ظلمی کہیں کے۔ جوانا مرگ جائیا۔ آئے نا تجھے ڈھائی گھڑی
کی۔ نامراد۔ کیسا میری بچّی کو مار گیا۔ صدقے میں دوں تجھے اس جگہ پہ سے
جہاں میری بچی کی دائی نے ہاتھ دھوئے۔ ایسی کیا تیرے کلیجے میں
چٹکی توڑ لی۔ اندر ذرا آ۔ کھا نہ جاؤں تو سہی۔ ٹوٹیں تیرے ہاتھ، نگوڑا
غارتی کہیں کا۔
جمیل۔ بی امّاں یونہی خفا ہوئے جاتی ہو۔ کسی اور کی بھی سنو گی؟ اس نے

مجھے ناحق گالی دی۔

رقیہ۔ ہوگی کوئی مال زادی تیری اماں۔ نگوڑا گھر میں سنبھو لیا ہوا ہے۔ گالی دی تو اچھا کیا۔ ہے ہی تو اس قابل موئے جوتیوں خورے۔ اٹھتے جوتی بیٹھتے لات سہے تو ٹھیک ہے۔ جانہار۔ ناشاد۔ ایسی تجھے کیا گالی دی جو تیرا کلیجہ چھید گیا۔ موت نہ لئے! خدا کی قسم نہ آیا تو مار ہی ڈالونگی۔

جمیل۔ میں نے اس علامہ کا کیا بگاڑا تھا، جو مجھے ان نے انگریز کہا۔ ہم تو اسے چاہیں۔ رتی میں سے رتی دیں۔ حلق کا نکال کے کھلائیں۔ اس پہ یہ ہمیں انگریز کہے۔ تم ہی منصفی سے کہنا۔ میں حرام خوار ہوں، سور کھاتا ہوں پھر کیوں کہا ان نے؟

رقیہ۔ اللہ ری مکارہ کیا فیل مچائے ہیں۔ اپنی کوئی خطا ہی نہ بتائی۔ تجھے شرم نہ آئی بڑے بھائی کو انگریز کہا۔ جب ان نے مارا۔ تو اپنی دفعہ کو کیا کیا لوٹی ہے۔ کیا کیا بیٹی ہے۔ اوری حرافہ تیری حرفتیں میں ہی خوب جانتی ہوں پھر کل تیری استانی سے جا کے نہ کہا تو جب ہی کہیو۔ آج کو بھائی ہے۔ کل کو خصم ہوگا۔ دوسرے ہی دن چوٹی کاٹ ڈلیا واپس کردیگا مجھے نہ معلوم تھا۔ یہ تجھ میں گن بھرے پڑے ہیں۔ اچھا استانی نے سبق پڑھایا۔ کسی کے گھمنڈ پر نہ رہیو۔ گلے کے سے بل نکال ڈونگی۔ زیادہ لاڈ میں نہ آئیو۔ تماچہ کہیں کی۔ بھائی کو دیکھ نہیں سکتی۔ ان نے تو ایک ہی

چوٹا خنجی پہ چھوڑ دیا۔ مجھ وال کا ہوتا۔ تو چھریوں کے غسل کراتا۔ اور پیر دھیے
مچانے تو دیکھو۔ راہ چلتے مردوئے سنیں۔ انگریزن کہیں کی۔ ذرا شرم نہیں
ذرہ برابر غیرت نہیں۔ اچھی فرنگیت چھائی ہے۔ لونڈوں کے ساتھ گد گڑے لگوا
بہو بیٹیوں کی طرح کونے میں جی ہی نہیں لگتا۔ ڈوبی دی ہے انگریزیت میں۔
جب دیکھو مشت ہشت۔ جب دیکھو دھینگا مشتی۔ یوں عورت سے زیادہ ہونے
کو آئی۔ بے بہرہ مستانی۔ چلی جا گرجا۔ اچھی ہے استانی بیچاری۔ تالش کے
رکھا ہی نہیں جاتا۔ دہائی باوا۔ میں ایسا مدرسہ پڑھوانے سے۔ لونڈیا ہاتھو
سے نکل جائے گی۔ اب تو کسی کا ڈر ہی نہیں مانتی۔ بیٹی ذات اور گھنڈ بلا
دیکھو۔ کوٹھے پہ ہاتھ رکھ کے ناچنا۔ تھرکنا۔ پھدکنا دیکھو۔ فرنگن زادی۔ ٹھگو ٹے سے
چہرے پہ ابھی سے ٹھیکرے لوٹنے لگے۔ یہ کرسٹانیوں کی صحبت کا اثر
ہے۔ نہ آنے کی شرم نہ گئے کا لحاظ۔ دیدے کا پانی ہی ڈھل گیا۔ انگریزن
بنچی۔ ٹھیٹھ دن۔ بے شعور۔ دور ہو۔ چل۔ اندر جا کے بیٹھ۔ کام پہ دیدہ ہی
نہیں ٹکتا میری ملکہ وکٹوریہ کا۔

ماہرو ایسی ایانی تو کبھی نہیں۔ اتنی باتیں سنتی اور سہار جاتی۔ مشن کی پڑھی
والی۔ بڑی مس کی ناک کا بال۔ پانچ برس کا کیڑا کیا ہوتی ہے۔ اس وقت
سے اس دم تک سائیالیوں کی صحبت رہی۔ برابری رگ رگ ریشے میں
سرایت کر گئی۔ ماں سے دبتی اس کی جوتی۔ جو جو منہ میں آیا۔ دو بہ دو سنایا

ماں بھی ایک جلاّد ن۔ ٹانگ برابر چھوکری کی یہ برابری دیکھ۔ آپے سے باہر ہو گئی۔ نکال پاؤں سے جوتی۔ خوب ہی چندیا اُتّو کی۔ گیارہ برس کی ڈھوّا۔ وہ کیوں پٹتی۔ لپٹ پڑی۔ ناخونوں سے سارا منھ خوم خون کر دیا۔ اُدھم مچی۔ ہمسائیاں۔ دیواروں پر چڑھ آئیاں۔ بیری والی ہمسائی جو کھڑکی میں سے نہ آئیں اور بیچ بچاؤ نہ کرائیں تو دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہی ہو جائے۔ ہمسائیاں ماں کی تشنی لیتیں۔ بیٹی کو پرچاک نہ دیتیں۔ بٹیا۔ ماں بیٹیوں کی بڑھتی دیکھ پہلے ہی سٹک گیا تھا۔ آیا۔ گیا۔ اپنا۔ پرایا۔ سب ایک منھ ہو گیا۔ ماہرو کو بڑا گھمنڈ مس جینیا اور فادرجان کا تھا۔ وہ ہوتے تو شاید بچاڑی کی مامی پیتے مشن کی ڈولی آئی۔ تو ماں نے کہاروں کو للکار بتائی۔ اس دن جو یہ مدرسے نہ گئی۔ تو شام کو ہوا خوری سے واپسی کے وقت بڑی مس کھڑے کھڑے آئیں۔ ماں نے آنکھوں میں رکھا۔ تنہائی کا موقع نہ دیا۔ لیکن اُستانی شاگرد میں جانے کیا گٹ پٹ ہوئی۔ اور اُستانی جی سدھاریں۔ رقیہ پہلے ہی تھی دھان پان۔ آئے دن کی مرضیں۔ اوپر ڈھینگڑی بیٹی سے کشتم کشتا ہوئی دھڑکن کا زور ہوا۔ سارے دن لوتھ ہوئی پڑی رہی۔ کس کا کھانا کس کا دانا پکنا ریندھنا کیسا۔ اوّل شام ہی سے پڑ رہی۔ میاں کا زخم تازہ ہی تازہ تھا۔ لونیاں اور دریاں لینے امرتسر گیا تھا۔ نگوڑی کا راج لٹتا تھا۔ جو جلیاں والے میں جھلسا پھرا لاش تک کا پتہ نہ لگا۔ جمیل اور ماہرو اوپر تلے کے بہن بھائی تھے

برس دن کا چھٹا یا بڑا پایا تھا۔ سال بھر کی سوڑھ رقیہ کی تھی۔ کچے پکے ملا کے نو ہوئے۔ بیچ بیچ کے یہ دو رہے۔ جمیل کی بساط ہی کیا تھی۔ بارھواں سال چھوٹی سی دوکان سنبھالے بیٹھا تھا۔ ایسی حالت میں بڑھائی ڈرہائی گیا خاک ہوتی۔ صبح کی حشرات میں کچھ کھا کے نہ گیا تھا۔ سارے دن کا بھوکا پیاسا۔ لخ لخ کرتا آیا۔ گھر میں اندھیرا۔ چولہا اوندھا۔ ماں سے پوچھا۔ واجبی سا جواب دیا اور پڑی رہی۔ کیا مقدور جو جمیل نے دم بھی مارا ہو۔ چپ ہو رہا۔ ماں کی مامتا پھر دل نہ مانا۔ اٹھی۔ روٹی کے ٹکڑے کوٹ۔ گڑ ڈال، پتیلی چڑھا دی۔ پکا۔ بچے کے آگے لا دھرے۔ کوئی ہنسی تو تھی نہیں مغل کا خون تھا۔ جلال اتنا نہ اُترا تھا۔ خود تو نہ کھا۔ چپکے سے بیٹے کو اشارہ کیا۔ کہ بہن کو بھی کھلا لے۔ اُس نے بہن سے کہا۔ وہ آئی اور اپنے کھانے بیٹھ گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا لیکن ماں نے زبان پہ بھی رکھا ہو تو بری چیز کے برابر ہے۔ بیٹے نے بھتیرا کہا۔ کھایا پر نہ کھایا۔ بیٹی نے کھا پی سب برابر کیا۔ رقیہ کو رنج صدمہ میں ایسی غفلت کی نیند آئی تھی۔ کہ مُردوں سے شرط بد کر سوتی۔ بچے کھاتے ہی رہے۔ اور وہ سو رہی۔ بچہ بھی سارے دن کا تھکا ہارا۔ گھوڑے بیچ کے سویا۔ ہر دکھی تو گیارہ برس کی۔ پر تھی بڑی سَتّا۔ اچھے اچھوں کے کان کاٹتی تھی۔ دم چرائے پڑی رہی۔ آدھی رات ہوئی تو تالی کی آواز آئی۔ چپکے سے اُٹھی۔ جا کے کنڈی کھولی۔ بڑی مس، دو اور مردوے کالے کالے جبے پہنے صلیبیں گلے میں پڑیں۔

گلی کی قندیل کی روشنی میں صاف معلوم ہو رہی تھیں۔ اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔ "بد باہر والکھڈ اونڈ لیسوع مسیح تم کو برکت دے۔" یہ کہہ اور اپنے ساتھ لیے چل دو جا۔ صبح ہوئی۔ کھٹولی خالی تھی۔ ماں نمانی کو اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ بیٹی یہ کھل کھیلے گی۔ اُٹھی۔ کنڈی خلاف معمول کھلی پائی تو ذرا گھبرائی۔ بیٹی کو ہشیار کیا۔ اُدھر ڈھونڈا اُدھر ڈھونڈا۔ جب ڈھونڈ ڈھونڈ تھک چکی تو بیقرار ہو آوازیں دیں۔ ہوتی تو آتی۔ بچے کو باہر بھیج سب طرف ڈھنڈوایا۔ نہ ملی تو چادر ڈال عمر بھر میں پہلی دفعہ باہر نکلی۔ کلیجہ پکڑے پکڑے پھرتی گلی گلی بازار بازار زار زار قطار روتی۔ ہر ایک سے پوچھتی۔ تھانہ کچہری سب ہی گیا۔ بچی کا پتہ چلنا تھا نہ چلا۔ کلکتے اور صوبوں کے مقامی لاٹھ پادری جو ہزاروں کی تنخواہ ہندوستان کی آمد سے پاتے ہیں، وہ مفت میں نہیں ملتی۔ کچھ تو کارگزاریاں ہوں۔ جو ایک دفعہ پھنس جائے اور پھر نکل جائے تو ایسے بھولے نہیں۔ آخر بیچاری رو پیٹ، صبر کر بیٹھ رہی۔ قصور کس کا؟ ماں کا یا بیٹی کا، یا بڑی ڈاڑھی والے مولویوں کا؟
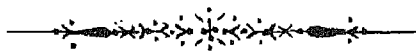
نائی کی کرامات

بدرالدین۔ دیکھنا! کہو تو گھر آتے وقت بال کٹواتا آؤں؟

اہلیہ بدرالدین۔ (تنک کر) اوئی، ایسے تو بال نہیں بڑھ رہے ابھی تو کٹوائے ہیں۔ بال کٹوانے پر بھی کوئی نہیں تھو لیگا۔ ایسے حسین نہیں ہو کون سی ایسی دولت کو کائی لگ رہی ہے۔ اچھی، تمہیں اس کا ذرا خیال نہیں، کہ آمدنی کی تو یہ کشش، اور تم کو روز حجامت کو چاہیئے جس کی آمد اتنی قلیل ہو، اُس کو تو کوڑی کوڑی کی بچت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور نہیں تو خیر آگے تم جانو۔

"خیر، آگے تم جانو" یہ فقرہ گویا ایک طرح کی اجازت تھی۔ بدرالدین فوراً لپک کے اُٹھا اور پردہ اُٹھا، گھر کے باہر خوشی خوشی مُسکراتا ہوا نکلا۔ خوشی اِس بات کی نہیں تھی کہ خاص تراش کے پاس جائے اور ذرا مُنڈ منڈا کر کچھ روپ نکالے؛ بننے سنورنے کا تو کبھی بھولے سے بھی خیال نہ گزرتا تھا، اور نہ بیچارے کو کبھی اپنے حسین ہونے کا گمان ہوا۔ صورت دیکھو تو بیچارا سیدھا سادہ، نام کو بناوٹ اور خود آرائی نہیں۔ ٹوپی کے نیچے سے لمبے لمبے بن کنگھی کیے پٹے

لٹکتے، ڈاڑھی نہ گول نہ چوکھونٹی نہ بیضوی، کوئی وضع ہی نہیں، اللہ توکلی بڑھتی چلی گئی۔ الجھی الجھائی جیسے اجڑے باغ میں ٹینٹ کی جھاڑی۔ کبھی لب لوانے کا ہوش نہ ہوا۔ مونچھیں بڑھتے بڑھتے منہ میں گھسی جاتیں۔ ہر وقت کی تمباکو نوشی سے زرد زرد چیکٹ لگی۔ بدرالدین تو برسوں بھی حجامت کا نام نہ لے۔ قینچی استرے کو دور سے سلام کرے، کیوں کہ بڑھے اور اجھے گھن دار بالوں میں ہاتھ کی انگلیاں نئے مضمون کے تفحص میں، گاؤں کے کتوں کی طرح خرگوش کی تلاش میں جھاڑی جھاڑی چھان مارتی۔ بدرالدین کو تھوڑی بہت ترکیبیں یاد تھیں۔ یہ کس کو خبر ہے کہ نائی کے ہاں کتنی دیر لگے: گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے، یا اس سے بھی زیادہ۔ بدرالدین کی بیوی کے پاس اس کا کیا جواب تھا، جب سیدھے سبھاؤ اور سادگی سے کہدیا جاتا "بیوی! آج تو خلیفہ کی دکان پر بڑی بھیڑ تھی۔ دس جنے تو مجھ سے پہلے ہی سے بیٹھے تھے" یا یہ کہ "بچارے خلیفہ کی وہ آنکھ نہیں رہی۔ گھٹتی کا پھرا ہے۔ یوں کہو کہ بچارا پرانا ہے، لوگ قدامت کی مروت سے چلے جاتے ہیں ورنہ اچھی طرح اب سجھائی نہیں دیتا۔ گن گن کے بال کترتا ہے۔ وہ پہلی سی پھرتی اور چالاکی ہی نہیں رہی" گھر والی غریب کو کیا خبر، جو نہی دوکان میں گھسے اور بال کٹوانے کی تلاتوپ ڈالی "جلدی، بھئی، جلدی!" اس کی پرواہ نہیں کہ ٹیڑھے بڑنگے کیسے ہی کٹیں۔ بلیاں پڑ جائیں، چاہے کچھ ہی ہو، پر جو ہو آنکھ جھپکانے میں ہو جائے۔ جلدی سے مضراب پھینک پھانک، دستی آئینہ ٹیک

چلنے کی تیاری کی۔ شاگرد نے اگر کپڑ کو بچی سے کپڑوں پہ گرے بالوں کو صاف کرنا چاہا۔ تو بیزارگی سے اُسے روک اور گھڑی نکال، وقت دیکھ، کہ ابھی خاصہ گھنٹہ ایک اور ہے، یہ سوچ اُڑا، اور مارا مار پہونچا گدڑی بازار، کباڑیوں میں گھس، گرد آلود پُرانی کتابوں کے انبار کو اُلٹ پلٹ، یہ دیکھ وہ دیکھ، بے شمار کتابیں گھڑی دو گھڑی کی کیا حقیقت اور کس گنتی میں۔ وہ چلو بھئی، ایک گھنٹہ اور سہی کہہ دینگے کہ مجھ سے پہلے کے آدمی بیٹھے تھے، میاں آصف علی نے کانگریس کی طرف سے نائیوں کی پنچایت کی تھی، سب کی دُکانیں بند تھیں، بس ایک ہی کھلی تھی، معمول سے زیادہ جمگھٹ تھا۔ لگے بندھوں کے علاوہ اور بھی آگئے تھے،" میلی کچیلی، رنگ اُڑی کتابوں کے ڈھیر میں بدرالدین اور ہی ہو جاتا تھا۔ دُنیا رہنے کے قابل معلوم ہونے لگتی اور زندگی کی قدر ہو جاتی۔ شاید ان کتابوں میں کوئی ایسا عجوبہ نسخہ دستیاب ہو جائے، جس کی دنیا میں دوسری نقل نہ ہو۔ لیکن یہ آرزو پوری کبھی نہ ہوئی۔ کتابیں اُٹھا جو دیکھنی شروع کیں، تو گویا اپنی ہی ملکیت ہے۔ ایک لفظ اس میں کا پڑھا، تو دوسری کا فقرہ۔ مضمونوں کی سُرخیاں سرسری طور پر دیکھتا چلا گیا۔ سینکڑوں ورق اُلٹ پلٹ کر ڈالے۔ چہرہ ہشاش بشاش، اور زندگی کی رو دوڑتی معلوم ہوتی۔ ناک سکسی درست کوٹھے والیوں کو چاوڑی کے بے فکرے آوارہ دیکھ کر اتنا نہال نہ ہوتے ہونگے، جتنا ان ردّی، کرم خوردہ کتابوں کو دیکھ دیکھ کر بدرالدین کھلا جاتا تھا۔

ساری خوشی کی کور کسر گھر پر نکل جاتی تھی۔ ان خوش وقتیوں کا مزا، جہاں مدرالدین گھر میں گھسا، اور سب نکل گیا۔ جورو بلا کی جھلّو، چلتی ہوا سے لڑتی، راہ چلتے "ترّاہ، ترّاہ" پکارتے، سنتے دانتوں میں انگلیاں لیتے، اپنے بیگانے کانوں پہ ہاتھ دھرتے۔ حلق میں بانس، زبان کا تانتوا ٹوٹا ہوا، ہر محلے کے کانوں میں انگلیاں دیتے خصم کو جوتی تلے رکھتی، جس کل چاہتی نچاتی، کان پکڑ بٹھاتی کیا مجال جو بیچارا پل بھر بھی تو چین سے بیٹھ کوئی نیا مضمون سوچ لے، یا دم بھر کو خیالستان میں پہنچ شاعرانہ طمانیت اور مفروضہ قناعت و حقیقی انبساط سے سرشار رہو، مسرور رہو، اچھوتے اور انوکھے خیال کی اتفاقی گرفت سے کیفیت تو ہو لے، جہاں اس دنیا میں پہنچا، اور غوطہ میں آیا۔ پیچھے جھاڑو، بلا کی طرح پیچھے پڑ گئی "اوئی، خدا کی مار! جب دیکھو موئے پوستی افیمیوں کی سی پینک۔ ہاں مست بنے تھے، فاقہ مست آنکھوں دیکھے۔ دنیا بھر کی نحوست نگوڑی آ گئی ہے۔ نگوڑے کو جب دیکھو اونگھتا ہی رہتا ہے۔ من منی صورت ہوا منحوس کہیں کا میری ہی تقدیر میں لکھا تھا۔ سارے دن مکھیاں مارا کرتا ہے۔ بڑھوا کی دُم، پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل، کتاب کیڑا، جب دیکھو مرا کتاب گیا۔ نے بیتوں کا مشغلہ، آدمے کا آوا ہی ڈلدر۔ دادا صاحب بازار تی کی پیچھے کانٹے ہو کے بیٹھے، باوا اپنے بٹیروں کی پالی میں بازی لگائی، لنگڑا کی جھنجھنیاں پہنیں، اور بیڑی خانہ میں سڑ سڑ کے مرا، چچا نے پتنگ بازی میں

کو لہ تڑوایا۔ یہ بھٹکتا پوستی تاشا دکتاب بازی میں پاگل خانے کی سیر کرے گا۔ آٹھا ؤ
بیوی موٹڈھا کہ یہ کنبے کا کنبہ بھونڈا۔ میری جان کو تو یہ کتابیں سوکن ہوگئیں۔
سارا دن موئی ان کڑکھائی کلیجہ جلیوں میں گھسا رہتا ہے۔ یہ اپنی کو سزا دار ہے نہیں
ماباپ بختیاں میسر ہوں۔ تن پہ نہیں لتّا۔ پان کھاؤں البتہ۔ محنت مزدوری سے بھاگ
کتاب کی آڑ میں منھ چھپانا، منحوس نکموں کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ نام کو قلم دوات
سامنے رکھ لی، کتاب لی ہاتھ میں، سارے دن غالیچے پہ پڑے اینڈا کیے، پان
کھائے، حقہ گڑگڑایا، کمائے دھمائے جوتی، اللہ دے کھانے کو بلا جائے
کمانے کو۔ باوا کی کھتی گڑی ہے۔ روزگار کے نام سے جان نکلتی ہے۔ لشتم پشتم خرچا
ہوا تو تیاں لڑائیے، خشک میں تو سوجھیں یا وسے اور کھپا وسے۔ اپنے ایمان
کی قسم ہے تمھاری ان حرفتوں کو میں ہی خوب سمجھتی ہوں۔ پھوٹ گیا میرا تو نصیبہ
مٹ دوں اس گھڑی کو جب میرا تمھارا سنجوگ ہوا۔ پڑیں اس میّا باوا کی گور
میں کیڑے! مجھے تو جیتے جی درگور کیا۔ ایسے نفاختوں میں جھونکا، خدا کی مار!
بیچ ہتیا ہوا مردوا کسی فوج میں ہوتا لفٹن، جرنیل، کرنیل، مرزا منش قلم دوات لیکر
بیٹھے ہیں کمائی کرنے۔ کم دنیا کی دم۔ نگوڑے کی تحریر میں بھی تو حلاوت نہیں
دنیا بھر کے زرغل مضمون لکھے، اور اسی کمائی پر گذارے کی توقع۔ ایسے ہی
وہ موئے اخبار رسالے سڑل، دنیا بھر کی آخور کی بھرتی، جو ایسے بیڈھنگے مضمون
لے لیں۔ جھوٹی سچی خبریں گھڑیں، سرکار کے خلاف مضمون لکھا۔ بھٹکتی صورت

کسی دن ٹنڈیاں کسی جائینگی، چودہ طبق روشن ہو جائینگے"۔

اہلیہ بدرالدین کی صورت سیرت دونوں نورعلیٰ نور۔ نہ روپ نہ روپا۔ بدرالدین بچارا یوں کہو کہ نیک کوک کا تھا، کیئے کو بھگتتا تھا۔ سنی کو ان سنی کرتا۔ جو دھیرا گرجتی برستی، یہ دم نہ مارتا۔ سب چپکا بیٹھا مٹر مٹر سنا کرتا۔ جھلسا بھری جسٹرنی صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل، اب یہ جتنے میں سمائی تھی کہ اگر میا باوا بدرالدین کے ہاں نہ جھونکتے، ہزار اچھے سے اچھے بر جٹر تے، اور تحفہ سے تحفہ باتیں آتیں۔ ہمیشہ بچارے کو ڈلے مارتی، کہ نہ اس کی طرف سے پیغام جاتا، اور نہ یہ خواری ہوتی۔ جانتی تھی کہ نوکری ملازمت جوگا تو ہے نہیں رات دن کوٹھری میں بٹھائے مضمون لکھوایا کرتی۔ کوٹھری کا ایک کواڑ اپنی طرف کا کھلا رکھتی تاکہ ہمیشہ دیکھتی رہے، کہ میاں پان تو نہیں چبا رہے یا چرٹ تو نہیں اُڑا رہے، اور جہاں بدرالدین کسی ادبی خیال میں منہمک ہوکے بحر تفکر میں تلاشِ مضمون کے لیئے غوطے کھانے لگا، اور یہ چیل کی طرح گر جا کے جھنجوڑ مارا۔ "کیوں! کیا دوسری کی فکر ہے؟ کوئی اور گھر ڈبانے کی صلاح ہے؟ اور کس نصیبے پھوٹی کے گھیرنے کا ارادہ ہے؟ بھلا اب کون سی کرموں جلی تمھارے جال میں آتی ہے؟" بچارا دم بخود صبر کرکے اور اندر ہی اندر

لہ کرموں جلی۔ نصیب جلی۔ دلی کی بیجابنوں کا محاورہ ہے۔ اکثر ہندوستانی عام عورتیں بھی استعمال کرنے لگی ہیں۔

اَونٹ رہ جاتا۔ سب کچھ اپنی جان پر اُگیزتا۔ لڑائی جھگڑے اور فساد کی بات سے
کوسوں دُور بھاگتا۔ ہاں ایک کرتب ازبر تھا۔ حجامت کا چسکہ خوب چل جاتا تھا
آج گھنٹہ پون گھنٹہ ٹل جائیگا" جلدی سے بال کاٹ دو اور ڈاڑھی تراش دو"
مضراب جلدی سے خود ہی ڈال لی کہ وقت کی بچت ہو۔ افسوس کہ نائی بچہ برا
کا باپ نکلا۔ عدم تعاون کی تحریک سے پہلے سرکاری دانش گاہ میں وکالت
پڑھتا تھا۔ رانڈ بیوہ ماں کا کلیجہ ہی ایک بڑھاپے کا سہارا تھا۔ رانڈاپا اسی اُمید
پر کاٹا کہ پڑھ لکھ کر فارغ تحصیل ہو، کاٹھ کی روٹی بیٹے کو باندھ اپنی حیثیت سے زیادہ
تعلیم دلائی۔ اب ساری کائنات میں یہی ایک پھوٹی آنکھ کا دیدہ تھا۔ گاندھی کے
جھونکے میں یہ بھی پھوٹا۔ سرکاری مدرسوں میں سوائے کتابی تعلیم کے اور رکھا
ہی کیا ہے۔ دُنیا چلائی تو جوتیاں ہی کھا کے آتی ہے۔ جوانی اور کمانے کا زمانہ
مدرسوں کی نذر کر کے باہر نکلو، دُنیا کی ٹھوکریں کھاؤ۔ سنگلے سنگلے کی جھڑکیاں
سہو، تو بھی دل کے موافق ملازمت نہ ملے۔ لڑکا تھا وضع دار، مونڈن میں
ہاتھ صاف تھا، حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے مسلمانوں میں تجارت اور
پیشے کی ترویج کا بیڑا اُٹھایا تھا، یہ کہیں اُن سے ملا۔ اُنھوں نے اس کی گزران
وضع دیکھ، مزاحاً کہا کہ "تم نائی کی دوکان کھول لو، یا کسی بڑے حجام کے ہاں
جا بیٹھو"۔ غرض یہ ایک حمام میں حجامت بنانے پر ملازم ہو گیا۔ لمبا سوکھا سا،
چوبیس پچیس برس کا، داڑھی مونچھ کا صفایا، لال لال بجار والوں کی سی آنکھیں

عجیب ہوتی تھی، دل ہی دل معقولات اپنے میں بھی عیب نکالے اور دوسروں پہ نکتہ چینی
کرے، گاہکوں کو ناخواندہ صلاح مشورے دے، بک بک کر کے دماغ چاٹ گیا
بدر الدین نے سوچا کہ ایک چپ سو کو ہراتی ہے، اپنے آپ ہی بھونک بھونک کر
چپ ہو رہیگا۔ منہ نہ لگایا۔ بارعب خاموشی سے کمینوں کی جسارت کم اور ہمت
پست ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ ہی بکتا رہا۔ "بال کٹینگے اور داڑھی ترشے گی۔ صاحب
بہت مناسب میرے خیال میں خش خشی ٹھیک رہیگی۔ استرہ ٹھیک رہتا۔ نہیں صاحب
یہ دیکھئے ٹھیک نہیں لمبے لمبے جھونٹے چودھویں ناپ کی کالی اوگیاں لٹکتی ہوئی
یہ داڑھا جھال کا چھتہ کس کام کا۔ آج کل آگ برس رہی ہے۔ کیا گھمس ہے۔ ایسا تو
موسم اور یہ بالوں کا پولا رکھنا کس عقلمند نے بتایا ہے۔ دماغ کا خون چوس لینگے
گردن کمزور ہوگی، کمر جھک جائیگی۔ مجھے تو دیکھے سے وحشت ہوتی ہے۔ آپ کو
گھبراہٹ نہیں ہوتی؟ میں نے جو دیکھا کہ یہ گرمی بلا کی ہے تو سب کا صفایا کیا۔
میرے بھی بال خوب گھونگر والے تھے، اور یہ مونچھیں کھی تھیں۔ سب صفا چٹ
کیں۔ صاف صوف کر کرا فیصلہ کیا۔ اجی آپ بھی یہی کر لیجئے۔ پھیر دوں استرا؟
آپ کب کسی کی سنتے ہیں۔ یہ چلچلاتی دھوپ کہ چیل انڈا چھوڑ دے۔ اچھا ذرا
سر تو سیدھا۔ مردوں کو تو کبھی اتنے لمبے لمبے بال نہ رکھنے چاہئیں۔ لمبے بالوں
کی تو ممانعت ہونی چاہیئے۔ دنیا بھر کی خرابیاں ان بالوں سے شروع ہوتی
ہیں۔ سب کا علاج استرا ہے۔ حضرت استرا۔ کرزن کون تھا جانتے ہیں؟ فرنگی

تھا فرنگی - لیڈی نے ڈاڑھی مونچھیں مونڈ دیں، لاٹھ ہو گیا - ولایت میں کیا ہوتا
ہے؟ مجرم کے بال مونڈ دیتے ہیں - اس سے پہچان کر پکڑ لیتے ہیں - سب فرنگیوں
کے سر پر اُسترا چلا دو - آج ظلم و ستم و فرنگیت جہان سے نیست و نابود ہو رہے
فوج والوں کو فرماں بردار اور بہادر بنانے کے لیے ان کا سر مونڈ دو - مجاہدین
سر اور داڑھی سب کا صفایا کر دیتے ہیں - پاپ دُور کرنے کو جاتری مونڈن
کراتے ہیں - رسول شاہی چار ابرو کا صفایا کرتے ہیں چل چل بے احمق تجھ
کس وہم نے گھیرا، ڈاڑھی تو منڈا ڈال اور مونچھیں سمجھ بکھیڑا - ذرا سر کو ترچھا،
صاحب - ڈاڑھی تو دھوکے کی ٹٹی ہے، اس کی آڑ میں شکار خوب ہوتا ہے
كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ - گلوں کو خوب
صاف رکھو اور کلّوں کو خوب صاف - مونچھوں کو اس سے کم نہ سمجھو - داڑھی
مونچھ سے انسان کی اصلیت اور حقیقت چھپی رہتی ہے، جیسے شیر، دیو، پری کا
چہرہ لگا کے اندر سبھا والے اپنی صورت بدل لیتے ہیں اور دیکھنے والوں کو
دھوکے میں ڈال دیتے ہیں، اسی طرح داڑھی مونچھ رہنے دینے سے انسان
دوسروں کو خوب دھوکا دے سکتا ہے - داڑھی مونچھ والا بڑا مکّار اور دھوکے
باز ہوتا ہے - ریاکاری تو داڑھی مونچھ کا دوسرا نام ہے - ڈاڑھی مونڈ دو اور
آدمی ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسا کہ وہ ہوتا ہے - اصل حالت کھل جاتی ہے
اور جیسا اُس کا باطن ہوتا ہے ویسا ہی ظاہر ہو جاتا ہے - سب پر الم نشرح ہو جاتا ہے

کہ کیسا ہی ۔معصوم جیسے ماں کے پیٹ سے نکلا، ذرا فن فریب نہیں ۔ جیم فدؐ کی ڈاڑھی
مونچھیں منڈی تھیں ۔سوراج چاہو، تو ڈاڑھی مونچھ منڈاؤ ۔ اور جہاں ان کا
صفایا ہوا، اور خلافت کا مسئلہ بھی صاف ہوا ۔ترک اور جرمن کیوں ہارے؟
ڈاڑھی مونچھ کے جھگڑے میں ۔ دربار لاہور کیوں اجڑا؟ سکھوں کی ڈاڑھی مونچھوں
سے ہیں اور میرا بھائی، استا حجام نائی ۔ہیں ہیں ہیں گھوڑی اور گھوڑی کا بچھیرا
تو آپ جانتے ہی ہیں چوری، بدمعاشی، ڈوائریت، قتل وخون، فرنگیت، ظلم وستم
ڈائریت، لوٹ کھسوٹ حرام کاری سب موقوف ہوتی ہیں ۔اگر آج مجھے اجازت
مل جائے کہ سب عورتوں پر استرا چلا دوں، عورتیں کبھی خودسر نہ ہوں، جو آج
ان کے سر مونڈ دیئے جائیں جب گاندھی جی شہر میں آئے تو میں جاکر ملا اور ان
سے کہا کہ "مہاراج ! اب کے کانگرس میں اس کا اعلان کردو کہ کل قوم پرست
عورتوں کی چوٹیاں کاٹ ڈالی جائیں، نہیں جب سوراج ملیگا تو یہ برابر کا حق
مانگیں گی اور ایسا دق کرینگی جیسا ولایت کی حقوق طلب عورتیں کررہی ہیں"
وہ راضی نہ ہوئے تو میں نے میاں آصف علی، میاں شوکت علی اور میاں
محمد علی سے کہا ۔ان کے آپ ڈاڑھیاں، وہ کیا سنتے ! اور کیا پھبتی کہوں
بن آئے ہوئے لنگور سے ۔ داڑھی منڈواؤ ۔میں باز نہ آئی خدا کے نور سے ۔
حضرت مخدومی خواجہ حسن نظامی صاحب جن کی ہدایت سے میں نے حمام میں
حجامت بنانے کا کام شروع کیا تھا میری حوصلہ افزائی کو اکثر میرے پاس آتے

تھے ۔ مجھے اُن کی کاکلیں پسند آئیں ۔ میں نے اُن سے کہا۔ اُن پر کیف طاری ہوا، اور اُن کاکلوں کی درازی میں نفس کا موٹا پا نظر آیا ۔ فوراً نظر مقراض ہوئیں ۔ حجامت بنانے کو آیا جو نائی حجامت بناتے ہی مانگی رضائی ۔ مجھے بر محل یہ مثل یاد آئی کہ دمڑی کی گڑیا ٹکا سر منڈائی ۔ اب سب قوم پرست، خلافت کے حامی ڈاڑھیاں رکھنے لگے ہیں ۔ ڈاڑھیوں سے اگر سوا راج اور خلافت مل جائے تو پیشاب سے میری ڈاڑھی مونڈ ڈالنا ۔ ہاں چندوں کی رقم کے لئے ڈاڑھی بڑی ہاضم ہے، تھیلیاں کی تھیلیاں ہضم کر جاؤ اور خبر نہ ہو، مزے سے مونچھوں پہ تاؤ دو ۔ نائی کے بے نائی کے طبلہ بجائی کے، طبلہ میں طوطا، نائی میرا پوتا ۔ خدا نے چاہا تو میرا اُسترا سب پر چلے گا ۔ فرنگیوں میں اتنی بڑی جنگ ہوئی کیوں ؟ یسوع مسیح کے ڈاڑھی، سب پادریوں کے ڈاڑھی، کرنٹوں کے خدا کے بھی ڈاڑھی، اِس سے یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں ۔ نہ اُن کے خدا کے ڈاڑھی ہوتی اور نہ اتنی آفتیں دُنیا پر نازل ہوتیں ۔ میرا استرا وہاں تک پہنچیگا نہ کسی بادشاہ کا سر بچے گا اور نہ کسی ملکہ کی چوٹی ۔ کالے پہاڑ پہ ٹلوا ناچا، کیوں بے ٹلوے کیوں ناچا ؟ ابے کیوں بے ٹلوے، کیوں ناچا ؟ کیوں ناچا بے کیوں ناچا ؟"

برابر کے حجرے سے مالک، دوسرے کاریگر، شاگرد جلدی سے بھاگ کر آئے، اور بدرالدین کو مشکل اس کی گرفت سے نکالا ۔ نائی سب کو دھکیل،

قینچی بجاتا ہوا، ایک ٹانگ پر اچھلتا وحشیانہ حرکات کرتا، چاپ پھیری کھانے لگا، کسی کے قبضے میں نہ آیا، دو ایک کے قینچی سے خفیف سے زخم بھی آ گئے آخر اسی طرح ناچتا ہوا حمام کے اندر گھسا، صابن کی ٹکیہ پڑی تھی اُس پر پاؤں پڑا، اور نائی تڑاخ سے گرا۔ فوراً قینچی وغیرہ اُس کے ہاتھ سے چھین لی اور پکڑ چند آدمیوں کے ساتھ پاگل خانے کے طبیب پاس روانہ کیا۔ آس پاس کے دُکان دار، بیکار راہ چلتے، سب کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ کاریگر آپس میں بحثنے لگے "یار اس کا تو سان گمان بھی تو نہ تھا کہ ایکا ایکی اِس طرح دل اُلٹ جائے گا۔ کچھ تین چار دن سے اُس کے چہرے پہ ایک طرح کی وحشت تو ضرور معلوم ہوتی تھی۔ دماغ کو اصل میں گرمی چڑھ گئی، بات یہ ہے کہ جس کا کام، اسی کو ساجھے، اور کرے تو ٹھینگا باجے۔ جناب، بڑا خدا نے فضل کیا کچھ لیا دیا سامنے آ گیا، بھلے کو وہ تو یوں کہو کہ اُس کے ہاتھ میں اُسترا نہ تھا نہیں تو غضب ہی ہو جاتا۔ اماں چچا! میں نے کہا کہ کیوں صاحب لتنے دنوں تو ڑی تم نے اس بنگلے کو خوب بنھایا۔ قسم قرآن کی کہ کاریگروں سُدّاں وہ سب کا ایک دن فیصلہ کر دیتا۔ اماں، مدرسے کا پڑھا تھا، اس کی عقل ٹھیک تھوڑی تھی انگریزوں نے ایسے مہین حرفوں کی پڑھائی اسی لیئے نکالی ہے کہ سب بولانے ہو کے رہ جائیں"۔

بدرالدین کی عجیب نوبت، سہما ہوا ایک طرف کونے میں کھڑا تھر تھر کانپ

رہا تھا۔ ایسا کچھ بھوچکّا ہو کے رہ گیا کہ جب اُس نے کٹ کٹ قینچی چلانی شروع کی،
تو سُن ہو کے رہ گیا۔ اصل میں بدرالدین خود دل میں ملیدے سے متصفا رہا اور حجام نے
جو کچھ اٹرنگ بٹرنگ اوٹ پٹانگ، بے تکا بکا اس نے کچھ نہ سُنا۔ ہاں جب اس نے
ایک ہاتھ سے گدّی پکڑ کر اُس کی ڈاڑھی مونچھوں اور سر پر چو ماریں دبا کے قینچیاں
اور چند باہیں اُچٹتی ہوئی قینچی کی نوک لگی، تو چونکا، لیکن بجائے اس کے کہ
اُٹھ کر اُسے پکڑتا اور اپنے بچاؤ کی فکر کرتا، کچھ مبہوت سا ہو کے رہ گیا، ایک
طرف کی مونچھ بالکل اُڑ گئی، ریش بچّہ صاف ندارد، بائیں طرف کی ڈاڑھی کنپٹی
کے پاس سے جبڑے تک کی کٹ درے کی صورت نکل آئی پٹا ہی گناہ گار
معلوم ہونے لگا۔ حجام کے شاگرد اس ہیئت کو دیکھ ہنسی کو بہتیرا بہتیرا روکتے تھے
مگر توبہ، اُستاد کو البتہ بڑی پشیمانی تھی۔ اُس نے بہت ہی عذر معذرت کی اور
بدرالدین سے کہا کہ "آپ گھبرائیے مت، میں خود آپ کی حجامت بناؤں گا سر میں
نصیبِ اعدا، کوئی زخم تو نہیں آیا؟ اماں خلیفہ! ذرا دیکھنا تو میاں کی حجامت
کس وضع کی ہو۔ یہ جو بال کٹ گئے ہیں، اُن کی تلافی ہو جائے، اور یہ ڈاڑھی جو
چھدری ہو گئی ہے اُس کا بھی عیب ڈھک جائے۔ ساری حجامت ایسی ہو کہ ہر
ایک دوسرے میں کھپ جائے۔" خلیفہ نے جواب دیا کہ "واہ استاد! ڈاڑھی
نہ تو شاہجہانی رہ سکتی ہے اور نہ اورنگ زیبی، مجبوراً گل مچھے رہنے دئیے جاتے
لیکن کنپٹی کے سارے بال اُڑ گئے ہیں، ساری قلم کٹ گئی۔ فوجی چھلّی ڈاڑھی

کھلے گی نہیں، ریش بچہ کٹ گیا۔ کاؤسی ڈاڑھی بن نہیں سکتی۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں انگریزی پڑھے لکھے ہیں، آج کل تو اس کا چلن ہے، کہ کرزن وضع اختیار کی جائے۔"
بدرالدین سنکر چپ ہو رہا، الخاموشی نیم رضا، صابن کوچی کی تیز رفتاری نے تمام گالوں پہ نقش جما دی اور خلیفہ کے سدھے ہوئے ہاتھوں نے برسوں کی جمی کائی کو دم بھر میں پھاڑ، گالوں کی صاف وہموار سطح کو نمودار کیا! ایک شاگرد نے بڑھ کر دستی آئینہ پیش کیا۔ اب جو بدرالدین نے دیکھا تو اپنے آپکو پہچان نہ سکا، بالکل بے بدل ہوگیا تھا۔ تیس برس کے بعد آج اس نے اپنے رخسار دیکھے، حیرت میں رہ گیا، بن جھری کے، صاف صاف کھنچے ہوئے اوپر کو چڑھے، کچھ گلابی پن کی جھلک، مولوی بدرالدین ایک محویت کے عالم میں پہنچے۔ مختلف جذبات طرح طرح کے خیالات، کچھ رنج، کچھ شرم، کچھ حیرت، کچھ جھینپ، ان کے ساتھ ایک مخفی خوشی اور تبدیل ہیئت کی جھجک، اپنی دید سے دل بشر ہوا آئینہ ہاتھ کا ہاتھ میں ہی رہ گیا، اور اس کو اپنا وہ طالب علمی کا زمانہ یاد آیا، جوانی کی امنگ، طبیعت چونچال، مزاج میں شوخی، خود آرائی۔ خود بینی ہم چشموں میں ور رہنے کی آرزو، دانش گاہ کے پنجانہ میگزین میں ہزلیات کی صورت میں راز سربستہ کا انکشاف کرائی تھی۔ سخن سنج اس کا ایک ایک لفظ پنجانے کی دیوار و در سے نقل کر کے لے جاتے تھے اور دم بھر میں اس کی اشاعت اس سرے سے اس سرے تک ہو جاتی تھی کبھی طالب علموں کا خاکہ ہوتا اور کبھی استادوں کی مٹی پلید

کبھی حکومت کی ہجو ملیح، تو کبھی سرکار کے ہاں حضوریوں کی لتاڑ، غرض وہ لال بٹارا طرفہ معجون تھا۔ خطابات، قصیدے سب ہی کچھ ہوتے، سوائے گنتی کے دو آدمیوں کے اس گمنام میگزر وسے کوئی واقف نہ تھا۔ اس کو اپنے چہرے میں اپنے مشہور زمانہ حسین و جمیل نانا کی جھلک نظر آئی، جو ہفت زبان ہونے کے علاوہ، دنیا کا مشہور سیّاح تھا۔ خود بینی سے بدرالدین کا جی نہ سیر ہوا، اور دل ہی میں کہنے لگا۔ "کیا اس آئینہ میں یہ میری ہی صورت دکھائی دے رہی ہے؟" تھوڑی دیر میں اٹھکر دوکان سے چلنے لگا۔ تو خلیفہ، استاد، مالک اور شاگردوں، سب نے مل کر معافی چاہی۔ بدرالدین! اپنے آپ خیالات میں منہمک تھا۔ اسی بے خیالی میں کہہ گیا "کیوں کیا ہوا؟ ایسی بات کیا ہو گی خیر" کیا بات ہوئی اس کی اہمیت تو بدرالدین کا دل ہی جانتا تھا۔ اس طرح سے کہدینے اور بے پروائی ظاہر کرنے میں سرتاسر بناوٹ تھی۔ اگر کوئی بات نہ تھی تو معمول کے مطابق گدڑی کی خاک چھانتا، کباڑیوں میں گھستا، پرانی کتابوں کو ٹٹولتا نہیں، ادھر کا رخ بھی نہ کیا۔ رستہ کتراتا، چوروں کی طرح چھپتا چلا۔ "جورو تو آج خبر ہی لے ڈالے گی۔ گھر پہنچ کے آئے گی کمبختی۔ کیسی بری گھڑی سے نکلا تھا۔ کیا خبر تھی کہ حجّام کی دوکان میں ایسے مجنوں سے پالا پڑیگا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ خدا نے بڑی خیر کر لی، گھر چل کے آئے گی شامت آج نہیں بخشتی۔ جب وہ ناحق پر ہوتی ہے تو اور بھی تیز ہو جاتی ہے اور بے سمجھے

لڑتی ہے تو بس اللہ ہی پناہ میں رکھے۔"

بدرالدین کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ گھر جائے۔ رستہ میں بڑا سرکاری باغ، یہاں بے کار نکمے پڑے انڈا کرتے تھے۔ بدرالدین اپنی بے اطمینانی اور ہراس کو باغ کی سایہ دار روشوں پر تسکین دینے چلا، جہاں بڑے بڑے چھتر گھنیرے درختوں کی چھاؤں پانی کے چھڑکاؤ کی طرح ہو رہی تھی۔ ایک طرف پڑے ہوئے سنگین تخت پر بیٹھ گیا۔ قریب ہی دو نوجوان طالب علم موجودہ قومی مسائل کے حل کرنے میں گرم جوشی سے مشغول تھے۔ لیگ، کانگرس اور ہندو مسلمان کا نبدو کے متعلق اپنی آزاد آرار کا اظہار کر رہے تھے، جس میں علم و معلومات کم، ہاں گرمی اور تیزی زیادہ۔ اسی کج بحثی میں ایک ذرا دبا۔ اور چپ ہو کر بدرالدین کی طرف مخاطب ہوا، کہنے لگا "حضرت آپ کی رائے غیر جانب دارانہ ہو گی۔ آپ کو قومیات سے ضرور دل چسپی ہے اور آپ کی چال ڈھال، وضع قطع بتا رہی ہے کہ آپ قومی نمایندے ہیں، کانگرس کے رکن معلوم ہوتے ہیں۔ میں ہرگز غلطی پر نہیں، اب ہم دونوں میں آپ فیصلہ کر دیجیے۔ دیکھیے تینتیس برس کانگرس کو ہوئے؛ اس مدت میں ہندو کتنے میر مجلس ہوئے اور مسلمان کتنے منتخب ہوئے؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے بڑے آدمی، مثلاً سید احمد خاں نواب محسن الملک وغیرہ سب انگریزوں کے خوشامدی اور اس قومی سبھا کے خلاف تھے، بلکہ لیگ کو انھوں نے کانگرس کا مدمقابل بنا کر کھڑا کیا، اور

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ بدر الدین طیب جی نے کانگرس کے اصولوں کو سمجھا اور اس سے ہمدردی کی۔ اُن کو سب نے سر آنکھوں پر لیا۔ اب حافظ حکیم اجمل خاں صاحب مسیح الملک نے جو ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں، اس میں دلچسپی لی ان کا احمد آباد کی کانگرس میں انتخاب ہوا، اور بہت کامیاب رہا۔ مسیح الملک بہادر، جو ہندو مسلمانوں کے مِل جانے کو آسان تصوّر فرماتے ہیں، اور ہندوؤں میں اس میل ملاپ کا حقیقی مادّہ پاتے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ ان کے پاس جو ہندو جاتا ہے، غرض لے کر جاتا ہے اور وہ غرض بھی کیسی؟ جس پر زندگی تندرستی کا مدار۔ ایسا غرض مند جس قدر بھی خلوص کا اظہار کرے تھوڑا۔ ان کو کیا خبر جو چوکھٹ سے بھی دس گز باہر جوتیاں اُتار کر زمین چاٹتے ہوئے، گریہ مسکین بنے اُن کے حضور میں جاتے ہیں، وہ ان کے برادرانِ ملّت کو دفتروں میں اپنی جوتیوں سے ٹھکراتے ہیں۔ مصیبت کا مارا اگر ایک آدھ مسلمان ان دفتروں میں بدقسمتی اور اپنے اجداد کی جاں فروشی کے عوض میں کوئی جگہ پا لیتا ہے، تو اُس کا گارد میں اِس شہباز خاں کی کیا شامت آتی ہے۔ مسلمانوں کی تقدیر چکّر میں ہے۔ اُن کے لئے تو نہ کالی بھلی نہ سیت، دونوں کو مار و ایک ہی کھیت۔ عیسائی جنم کے بیری جس کا بنیا ہو یار، اُس کو دشمن کیا درکار، ہندو تو مول بیاز ہی میں سب کچھ رکھوا لینگے۔ آٹھ کروڑ مسلمان کیا عرب سے آئے تھے، اور جو ترک لٹیرے ادھر آئے، تو کیا جورو بچّوں کو ساتھ لائے تھے؟ مسلمان دوطرح کے ہندوستان

میں ہیں۔ ایک تو نومسلم اور دوسرے دوغلے، جن کی مائیں ہندنیاں، باپ ترک۔ یہ ہندی زمین ولائتی بیج، آدھوں آدھ زمیندار کا۔ نومسلم تو اپنا مول، اور یہ دوغلا رہا بیاج میں۔ ان سب کو واپس کردو، اور اس قرض سے بیباق ہو، تو دل صاف ہو۔ اس صورت میں سارے ملک میں ایک ہی قوم نظر آسکتی ہے۔ پھر کوئی تفرقہ ہی باقی نہ رہے۔ ٹھاکردواروں میں جہاں اور مورتیاں نظر آتی ہیں۔ عرب کا کملی والا بھی دکھائی دینے لگیگا۔ اونچ ذات میں تو جگہہ ملے گی نہیں، ہاں ان بچھڑوں کو جنڈال ضرور کھینچنگے۔ آریاؤں میں چوڑھے چمار سب کی کھیت، ان کی آنکھیں مسلمانوں کے تبلیغ دین نے کھول دیں ہیں، وہ سب کو ملالیں گے، لیکن سناتن دھرمی تو ان دوغلی ہنڈولوں کو کیوں پنچ کا شریک کرنے لگے۔ جو دوسروں کا سہارا لے کر ابھرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ سدا ڈوبتے ہیں۔ پرائے بوتے کھیلا جوا، آج نہ موا کل موا۔ عیسائیوں سے جنگ اور ہندوؤں کے برتے پر! اس میں جیت عبث۔ طو، پیار کرو، اسے کون منع کرتا ہے؟ لیکن پیار احتیاط سے ہو، یہ ہتھیلی جمی میں کلا کاٹا۔ آنکھ کھول کر ہوشیاری سے ہر کام کو کرنا چاہیئے، اندھا دھند کرنا جوتیاں کھانے کے لچھن ہیں۔ آگ سے نکلنے کے لیئے کنوئیں میں کودنا دانائی سے بعید ہے۔ ملاپ میں اپنے آپ کو مٹا دینا مجنونوں کا شعار ہے۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ ادلے کا بدلا ہونا چاہیئے۔ تو چاہے میرے جائے کو، میں چاہوں

تیری کھاٹ کے پائے کو، دوستی دشمنی میں تمیز کرنے والا سدا محفوظ، مامون رہتا ہے، اور جو عقل کا کچا، انگارے کو سونے کا ڈلا سمجھتا ہے، وہ اپنا ہی ہاتھ جلاتا ہے۔ انسان کھو کر بھی کچھ سیکھ لے تو بھی بھر پایا۔ ایک زمانہ ایسا آیا، اور ایک گروہ ایسا کھڑا ہوا، کہ اس نے اپنی سمجھ کے مطابق ضرورتوں سے مجبور ہو، مصلحتِ وقت کی خاطر مذہب کا پاس کیا، نہ ملت کا لحاظ۔ نصرانیوں کے ساتھ کھانا پینا، شادی بیاہ، نصِّ قرانی سے ثابت کیا، ظاہری اصطباغ تو نہ دیا، ہاں باطن میں تو ہر ایک عیسیٰ پرست ہو گیا۔ آدھی صدی بھی پوری نہ بیتی کہ اپنی تمام ملی روایات نیست و نابود ہو گئیں۔ معانی و مطالب قرآن میں وہ تحریفات ہوئیں کہ العظمت للہ۔ نہ تمدن رہا نہ معاشرت، سب کچھ بیگانہ ہو گیا۔ ان نامراد بڈھوں کی نئی مشعل میں جو چندا بچہ ہوا، وہ اپنوں کو تو سمجھ غیروں کی طرف ہمکنے لگا، یگانوں سے کنیانے لگا اور بیگانوں کی طرف جانے لگا۔ اس گونگے کی الل بچھیرا کلیل سے جو صدمہ ارکان اسلام کو پہنچا، اس کی درز دوزی کو بھی صدیاں چاہیں۔ دو پرستی کا اثر تو ابھی زائل نہ ہوا تھا۔ آنکھیں بند کر نیل کے کنٹھ میں کود پڑے۔ کالی پوجا کا کلنک لگا۔ اور ابھی معلوم نہیں، مرمل سے چار جوتیاں بڑھے نئے گروہ کے ہاتھوں رہی سہی بھٹی چندر یا کو کس کس رنگ میں غوطے کھانے ہیں، اور پکوڑی مل کے ساتھ میاں گلگلے کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔ روپیہ تو مشترک چندے کا اور خرچ ہو غیر اشتراکی طور پر ہندی کے پرچار

ہیں۔ کیوں صاحب! اُردو والے کیا کبھی کی گدھی چرائی ہے۔ اس کا فقط اتنا ہی
قصور ہے کہ ہندی ہو کر مسلمانوں کے سر تھپی۔ ابھی تو زبان ہی تک ہے، آئندہ دیکھئے
کہ زبان والوں کو واپس لانے کے لیئے وہی رقم صرف ہو گی۔ بھلا یہ اخلاص
پیار کی باتیں ہیں۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں پھر پھر اپنوں ہی کو دے۔ ہندو مسلم
مفروضہ اتحاد عنقا صفت ہے۔ خلافت سے ہندوؤں کو ہمدردی صرف اس وجہ سے
ہے کہ عراق میں اگر انگریز جم گئے، تو جب کبھی ہندوؤں نے ترقی کر کے آزادی
کی خواہش کی اور انگریزوں کی حکومت سے آزاد ہونا چاہا، تو عرب قبائل کے
ٹڈی دل، زر کی طمع میں انگریزی فوج میں بھرتی ہو۔ ہندوؤں کی سرکوبی کو
سر پر آدھمکیں گے۔ اس قدر قریب اور ایسی بہادر وجفاکش قوم پر انگریزی
تسلط، ہندوؤں کو اپنی آئندہ ترقی وبہبودی کے منافی نظر آتا ہے اس لئے اپنے
گگڑے کی سلامتی ہیں مسلمانوں کے قدح کی خیر مناتے ہیں۔ ترک موالات اور
مدرسہ چھوڑنے میں دار العلوم علی گڑھ کے تو دہ ضرب لگے اور جامعہ ملّیہ کا تیر دل
میں اُتر جائے، کاشی جی ساری بتیاؤں سے بزت رہیں۔ کانگرس میں کیا
مسلمانوں کے مساوی حقوق ہونگے؟ مسلمانوں کی پردہ نشین آن پڑھ عورتوں
کو ہندنیوں کے برابر رائے پرزہ دینے کا حق ہوگا، اور پردے میں سے رائے
پرزہ لینے کا کیا تصفیہ ہمارے قومی نمایندوں نے کیا؟ ملکی قومی ملازمتیں کیا
مساوی ملیں گی؟ یا آج کل جو دفتروں میں حال ہے اسی طرح کی آپا دھاپی ہوگی؟

ہندوستانی سفیر جو غیر ملکوں میں رہیں گے برابر کے ہندو مسلمان ہونگے؟
بحری فوج قایم ہوگی جس کے عہدے انگریزوں نے ہندوستانیوں پر حرام
کر دیئے ہیں، اور جہاز سازی کے مدرسے اور ہندوستانیوں کو جہاز رانی کا علم
سکھانے کی طرف سے حکومت نے اس قدر استغنا برتا ہی، کیا قومی حکومت
سوا راج ہندو مسلمانوں کو بڑے بڑے کالج قایم کرکے بحری تعلیم دے گی،
اور بے زر بے شوق مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کا بندوبست کرے گی؟
ایک معمولی سی بات ہی۔ رنگ، جس پر ہندوستان کی عورتوں کے سہاگ
کا دارومدار ہی، پہلے یہیں کی جڑی بوٹیوں سے، یہیں کے رنگریز تیار کرتے
تھے۔ اب یورپ کے رنگ نکل پڑے، اور ملکی صنعت بالکل تباہ ہو گئی۔ لاکھوں
روپیہ کا رنگ غیر ممالک سے آتا ہی۔ پہلے اس کی طرف توجہ کریں۔ قوم کی طرف
سے عورتوں کے لیئے رنگ حرام ہو جائے۔ صرف نیل، ہلدی، گیرو، ہارسنگار
ٹیسو، کسوم کے رنگ کی اجازت رنگیلیوں کو دی جائے، ورنہ آزادی کی سوگ
میں ملک کی عورتیں سفید لباس پہن سوگ منائیں اور آزادی ملنے تک سب
رنگ تج دیں۔ اور یہ کیا کہ کدیشی کپڑا نہ خریدو، بہت اچھا، نہ خریدو، مگر خریدا ہوا جلا ڈالنا
کس عقلمند نے سکھایا۔ ہندوؤں کا کیا؟ ان پاس تو چار انگل کی لنگوٹی اور گاڑھیلی
چوہا چیکٹ سی ستری ہوئی ساری، رکھی رکھی، نہ رکھی نہ رکھی۔ ننگا کھڑا اجاڑ
میں کوئی کپڑے لے، ان کی ساری جمیع پونجی زیور اور نقدی مسلمانوں کا اثاثہ

چار آنے جلے کپڑے، وہ بھی اگنی دیوتا کی بھینٹ چڑھے، تو رہ کیا گیا؟ ڈھاک کے تین پات۔ یہ تو زیور بھی بیچ بیچ کپڑے بنانے والے۔ ساری کائنات میں جو کچھ ہے یہی خوش پوشاکی۔ لوگوں کو یہ بھی کھٹکتی ہے مگر ہونک تماشا دیکھنے والوں کا کیا بگڑتا ہے؟ شرابیں پئیں، چرٹ پئیں، ڈبوں کے مکھن، پنیر، رب، مربے، میوے، ٹکیاں کھائیں۔ قومی نمایندے عالی شان ہوٹلوں میں ٹھہر کر اور رہ کر روز ہزاروں روپیہ انگریزی کھانوں میں اڑائیں، مالِ مفت دلِ بے رحم، وہ کچھ نہیں۔ سال کے پانچ سفید جوڑے میسا کر کے پندرہ بیس کے بھی نہ ہوئے وہ تو ایسے کھٹکیں، اور روز نئی روشنی کے سودے اور انگریزوں کے پس خوردہ اڑانے کی تقلید میں لاکھوں پھونک دیں اور جیتوں پر بل نہ آئے۔ حساب لگا کے دیکھ لیں کہ ہر آدمی کا سال بھر میں کپڑے پر زیادہ جھنکتا ہے یا غیر ضروری تکلفات کی چیزوں میں پھنکتا ہے۔ اس سے یہ میرا مقصود نہیں کہ کدیشی کپڑا خریدو خریدنے والے کی جنتی پہ سات طلاق۔ بڑبولوں کو نیچا دکھانا ہے کہ گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز۔ کم بختو! دوسروں کو تو کپڑا خریدنے سے منع کرتے ہو اور خود شرابیں ولایتی زہر مار کرو، انگریزی کھانے ٹھونسو، فرنگی شربت ڈکوسو، وہ سب جائز اور مباح۔ کہو! ان چٹ پٹی کی چیزوں میں کتنا روپیہ باہر کھنچ جاتا ہوگا۔ تمھاری غیرت حمیت تو ہم جب جانتے، میز کرسیوں کا بیٹھنا چھوڑتے، چھری کانٹوں سے نگلنا تجتے، ولایتی عطر، تیل، پھلیل، غازہ،

گلگونہ، صابن، منجن، سب کو حرام سمجھتے۔ یہ تو نہیں۔ ترکِ موالات کرو۔ خواہ مخواہ حاکموں سے لڑنا اور اپنے آپ کو تباہ کرنا ہی۔ موپلے تحفظ مذہب اور حمایت اسلام کے جوش میں آکے کھڑے ہوئے، کسی نے ساتھ دیا؟ سب تباہ و برباد ہو گئے۔ غریب مفلس تھے وہاں سے کیا وصول ہوتا؟ کھانا بھی سوکھی مچھلی اور اُبلے خشکے کے سوا نہ ملتا۔ پھر علما کا فتویٰ کیسے نکلتا؟ امن کے لیئے محفوظ جگہ کتاب تھی، کیوں بے زر حامیانِ خلافت کی خاطر اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے۔ شمالی ہند سے گئے ہزار۔ مجاہدین کا لشکر مولیوں کی مدد کو روانہ ہوا؟ مچھلی اپنی جان سے گئی، کھانے والوں کو مزا نہ آیا۔ اب رہا انگریزوں کا، یہ تو خود تباہ و برباد ہو جائینگے، کیوں کہ ان میں تعیش، بدمعاملگی، اور بے ایمانی دن بدن بڑھتی جاتی ہی۔"

دوسرا طالب علم جو اتنی دیر سے ناقابل برداشت تحمل و صبر اور غیر فطری خاموشی سے اس طولانی تقریر کو سن رہا تھا، بات کاٹ کر بولا "کیا مسلمانوں سے بھی زیادہ بدمعاملہ اور بے ایمان ہیں؟ اور ہندوؤں کے مساوی حقوق طلب کرنے کی ہوس تو ہے، پہلے ویسے اخلاق تو کر لو۔ جس قدر روپیہ غبن ہونے کی خبریں مشتہر ہوئیں، خائنوں میں مسلمانوں ہی کے نام تھے اور یہ خیانت رقم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیئے یا اشاعتِ دین اسلام و اردو کی ترویج کے لیئے نہیں ہوئی، بلکہ اپنی ذات کے لیئے اور نوابی ٹھاٹوں کے لیے

ہوئی ہے۔ کسی ہندو نے بھی قومی رقم میں سے ایک حبّہ خورد برد کیا؟ بدمعاش بے ایمان، بددیانت، اور مساوی حقوق کے طلبگار! کس منہ سے؟"

پہلے طالب علم نے کہا "مجھے بات ختم کر لینے دو، پھر تمھیں جو اعتراض ہو بیان کرنا۔"

بدرالدین کے سامنے جب اس قسم کے مسائل پیش ہوئے، چپ بیٹھا سنتا رہا، اور دل ہی دل میں کہنے لگا "تو گدھی کمہار کی، تجھے رام سے کوت[۱]؟ میں معمولی آدمی مضامین لکھ کر بسر اوقات کرنے والا ان جھگڑوں کی گہرائی کو کیا جانوں؟" لیکن قومی نمایندگی کی غلط فہمی کی اصلاح کی مشیخت نے اجازت نہ دی۔ غور و فکر کی چین جبیں پہ لایا، اور بناوٹی وقار و متانت سے ذرا کھوول کو پست کیا، اور سر کو بلند۔ بڑے آدمیوں کی طرح لکڑی کی گرفت کر کے بے پروائی کی شان سے دونوں طالب علموں پر نظر ڈالتا ہوا، سینے تلے قدموں روانہ ہوا۔ ایک انگریزن پاس سے گزری، اور چھل بل دکھا کے متوجہ کرنے کے انداز سے نکل گئی۔ ایک مشن کی میا نے مسکرا کر دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پیاری تھی اور یہ تبسم کچھ معنی خیز تھا۔ مولانا بدرالدین کو ابھی ایک گھنٹے پہلے دیکھ کر مسکراتی تو ہم جانتے، بیر کا سا ڈاڑھا، ریچھ کی سی صورت، چوہے کی سی مونچھیں، فلسفیانہ وضع۔ نئے مولوی بدرالدین صاحب کا دل

---

[۱] کوت = نسبت۔ اسی معنی میں اورنگ زیب کے زمانے کی اُردو میں بھی استعمال ہوتا تھا۔

باغ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھانے سے سیر نہ ہوا، اور جی نہ چاہا کہ ناچتے ہوئے فوّاروں
اور سنگ مرمر کے ساکت چُپ چاپ یونانی بتوں کو، مور پنکھیوں کے جھنڈ اور
روِش کی چھاؤں میں چھوڑ کر گھر جائے اور پاؤ صدی کی گھِس گھِس دقیانوسی
اُڑ لگنی بلا سے، جو چبوترے پہ چوکے کے فرش پر چاندنی بچھائے، سورج
کی طرف لیٹ گئے، رضائی اوڑھے، زانوں پر کُنا دھرے، اندر ہی ہاتھ
کیے، گٹھڑ کر بیٹھی چھالیا کتر رہی اور سِسک رہی ہوگی، جا کے "وہ بد وہو حسب کا
سلام" بی دیا سلائی، صبح کی گئی گئی شام کو آئی" ہو، اور پیشوائی ان
الفاظ میں ہو "دو ٹر کھولو، نکھٹو آئے" جو کمبختی نے گھیرا اور منہ سے کچھ نکل گیا تو
"کماؤ آئے ڈرتا، نکھٹو آئے لڑتا" کا کوڑا پڑا، اور برا بھلا تو ردھن میں
رہا۔ کچھ تو بیوی کا ڈر گھر جانے سے مانع اور کچھ حال کی ردِ صفائی نے طبیعت
میں لطافت اور مذاق میں ندرت و تبدل پسندی پیدا کی۔ چل کے اسے
تلوّن مزاجی سے تعبیر کرو۔ مگر مولوی صاحب تو اب نئے گلے اور نئی چراگاہ
کے شوقِ جستجو میں مبتلا تھے تیس برس پہلے انھیں رشتوں پر کیا ایلا گیلا
پھرتا تھا، بڑی سے بڑی حاکمانہ قوت کو ٹھوکر پہ مارتا، قانون کی خلاف ورزی
انتہائی خوشی، کسی لڑکی کا مضحکہ خیز خندکیا معنی۔

پچیس برس سے بیوی کے سوا کسی دوسری کا بھول کر بھی خیال نہ آیا۔ اِس
دوں ہمتانہ قناعت اور توکل نما تعطل نے پژمردہ سا کر دیا تھا۔ اِس قدر

زن مریدی بھی کس مصرف کی جو زن ترسی کی حد کو پہنچ جائے کہ دل بہلاؤ اور خوش وقتی کو بھی ادل بدل کی فصل اخلاقی توسے میں نہ نکلے اور نام نہاد اخلاق کی شرح میں کوئی مداس کے لیئے نہ ہو۔ اس میں تو فرنگی بہت اچھے کہ لطفِ زندگانی کے حصول میں عصمت و عفت کے وحشیانہ جذبات کو حائل نہیں ہونے دیتے اور کوتاہ بیں، تنگ نظر ایشیا والوں کی طرح آزادانہ مساوی انسانی عیش و کامرانی کا دروازہ اپنے منھ پر بند نہیں ہونے دیتے، بلکہ اس کو تحقیراً طور پر بدگمانی و حسد سے تعبیر کرکے حلاوت حیات کا فتح الباب کرتے ہیں۔

بدرالدین کی زن ترسی اس لیئے نہ تھی کہ وہ بیوی کا گرویدہ اس کی صورت کا والہ و شیدا تھا۔ نہیں، وہ دن بدن سر پر چڑھتی چلی گئی اور یہ دبتا اور جھکتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ کامل طور پر مسلط ہوگئی، اور تسلط جبر و ظلم کا مترادف ہے۔ بدرالدین کو اب ذرا احساس ہوا کہ پچیس برس تک اس کی وقعت نینفے کی جوں سے زیادہ نہ تھی۔ پوتڑوں کا نواب، ایسے نامور بھومیا، جہانیاں جہاں گشت نانا کا نواسہ اِس طرح پتیا مار کر بیٹھے۔ کون سا ملک اور کون سا بڑا شہر کون سی قوم اور کون سی بندرگاہ تھی، جہاں اس کے حسن کا شہرہ نہو، اور بے صورت کی بھوکی ایک آدھ عورت گھر اور کنبہ رشتہ چھوڑ اس کے ساتھ چل دینے پر اُدھار نہ کھائے بیٹھی ہو۔ بدرالدین میں اسی نانا کی تو شباہت تھی، اور پھر حالتوں میں یہ زمین آسمان کا فرق! چراغوں جلے گھر کا رُخ کیا۔ غیظ و غضب کے

غلبے نے بیوی کے غصّے کو بھی عقل کے ساتھ رفو چکر کیا۔

(حقارت آمیز انداز سے) اے اُٹھاؤ لال بردہ، برآمد ہوتے ہیں (حیرت و استعجاب سے) اے ہے کون ہے؟ کُنڈی کِن نے کھول لی؟ اوئی یہ کون؟ اب تک کہاں غارت تھے؟ صبح کا بھولا شام کو آئے وہ بھولا بھولا نہیں کہلاتا۔ اچھّی یہ چہرے پے لیڑی کِن نے کی؟ گوٹا کناری کنھیا کی مورت اور ڈاڑھی نہ مونچھ موئے مخنث کی صورت (نالت = نعلت = لعنت) نالت ہے۔ خدا کی پھٹکار موا مسخرا باولا، کیا سانگ بھر کے گھُسا ہے۔ اچھّی شہر میں باجنی باجے گی۔

باؤ صدی کی غلامی اور عادت بڑی محکومیت کو پسِ پشت ڈال، بدرالدین نے چہرے کے طور کو سنبھال، درونی جذبات کو بس کیا، اور حاکمانہ شان سے کہا "خاموش، میرے دل کی خوشی، جو چاہوں کروں، خود مختار رہوں۔ ڈاڑھی مونچھ منڈائی کس کی تھی؟ میری۔ خوب کیا۔ دیر سویر آؤں۔ گھر کس کا؟ میرا۔ تم کو دخل در معقولات کرنے کا کیا استحقاق؟ تم جورو ہو، شوہر نہیں ہو"

بیوی نے غور سے چہرے کو دیکھا ایک ایک لفظ شایانِ شان اور ایک ایک فقرہ صورت سا صاف، بول بالا یہ سی، سہم کے رہ گئی۔ آنکھیں نیچی کر گردن جھکا، ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "جوہر کار نے کہا۔ میں نے بغور زر (= بغور) سنا۔ حکم سے باہر نہ پائیں گے۔ باندی ہوں خطا وار۔"